Phone : 7500

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جنوری 1963ء

IN MEMORY OF THE QUAID

There is a special feature of the Islamic State which must not be overlooked. There, obedience is due to God, which takes practical shape in the observance of the Quranic principles and commands. In Islam, obedience is due neither to a king, nor to a parliament nor to any individual organisation. It is the Quranic provisions which determine the principles of our freedom and discipline in political and social spheres. In other words, Islamic state is an agency for enforcing Quranic principles and injunctions.

(Quaid-e-Azam, in reply
to a question in Hyderabad in 1941)

شائع کردہ :

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت ۷۵ پیسے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدل اشتراک	قیمت فی پرچہ	ٹیلیفون نمبر (۵۰۰۰)
ہند و پاکستان سے سالانہ ۸ روپے	ہند و پاکستان سے	خط و کتابت کا پتہ:-
غیر ممالک سے سالانہ ۱۶ شلنگ	۷۵ نئے پیسے	ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

جلد (۱۶) جنوری سنہ ۱۹۶۳ء نمبر (۱)

فہرستِ مضامین

۱- لمعات ——— ۲

۲- اولیاء اللہ کون ہیں؟ ——— (محترم پرویز صاحب) ——— ۹

۳- اسبابِ افتراقِ اُمت - از علامہ السید احمد السیفی ——— ۲۷

(ترجمہ و تلخیص سید نصیر شاہ صاحب میانوالی) ———

۴- مجلسِ اقبالؒ ——— ۴۶

۵- سوالات اور ان کے جوابات ——— (محترم پرویز صاحب) ——— ۵۲

۶- کلمہ طیبہ ——— (مولانا عبدالرب صاحب) ——— ۵۹

۷- ہر بہی خواہ کا گلا گھونٹنے والی قوم ——— (ایک اقتباس از تہذیب الاخلاق) ——— ۶۱

۸- احتساب ——— ۶۴

۹- عبرت آموز ——— ۷۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

کسی قوم کی مضمر صلاحیتوں کی نمود کا موقعہ وہ ہوتا ہے جب وہ قوم کسی خطرے سے دوچار ہو۔ اسی کو عام الفاظ میں امتحان، آزمائش، ابتلا وغیرہ کہا جاتا ہے۔ ایسے ہی مواقع پر یہ حقیقت نمایاں ہوتی ہے کہ اس قوم میں زندہ رہنے کی کس قدر صلاحیت ہے۔ انہی خطرات کے وقت یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس قوم میں الجھے ہوئے معاملات کو سلجھانے کی ذہنی استعداد۔ نامساعد حالات میں اوسان بجا رکھنے کا حوصلہ۔ ان خطرات کا مقابلہ کرنے کا عزم۔ اور اجتماعی مقاصد کی خاطر ایثار اور قربانی کا جذبہ کس قدر ہے۔ خطرات گویا وہ مقیاس ہیں جن سے قوموں کی مختلف قوتیں ماپی جاتی ہیں۔ یہی وہ گھاٹیاں ہیں جہاں ان کے مستقبل کے فیصلے ہوتے ہیں۔

اس وقت پاکستان ایک ایسے خطرہ سے دوچار ہے جس کی نزاکت اور شدت کی مثال اس کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ہمارے ہمسایہ ملک کے مذموم عزائم یوں تو پہلے دن سے ظاہر تھے لیکن اب وہ اس طرح کھل کر سامنے آ گئے ہیں کہ ان پر کسی قسم کے دھوکے کا پردہ یا شک کی چلمن باقی نہیں رہتی۔ اب یہ حقیقت بے نقاب ہو گئی ہے کہ بھارت کی تمام تر تخریبی اسکیموں کا رُخ پاکستان کی طرف ہے اور کشتیان بے بار و مددگار ہے۔ جب کوئی قوم ایسے حالات میں گھر جائے تو خود اس کی ہستی خطرے میں ہوتی ہے۔ قوموں کی ہستی کے خطرہ میں ہونے سے مراد یہ نہیں ہوتی کہ اس قوم کا وجود طبیعی طور پر باقی نہیں رہتا۔ قوموں کی ہستی ان کی سیاسی آزادی سے وابستہ ہوتی ہے۔ اگر کسی قوم سے سیاسی آزادی چھن جائے تو اس کی جداگانہ ہستی ختم ہو جاتی ہے۔

تحفظِ خویش (PRESERVATION OF SELF) کا جذبہ ہر ذی حیات کی جبلّت (INSTINCT) میں داخل ہے یعنی جب کوئی ذی حیات دیکھے کہ اس کی ہستی خطرہ میں ہے تو وہ اس کی حفاظت کے لئے اپنی پوری قوتوں کو مجتمع کرتا اور انہیں استعمال میں لاتا ہے۔ وہ اپنے بچاؤ کے لئے ہر ممکن کوشش کرتا ہے، حتّٰی کہ بعض اوقات وہ اس کوشش میں اپنی جان تک بھی دے دیتا ہے۔ چیونٹی ننھی سی جان ہے، لیکن جب اس کے راستے میں خطرے کا تنکا آ جائے تو آپ دیکھتے ہیں کہ وہ اپنی حفاظت کے لئے کس طرح ہاتھ پاؤں مارتی اور کس قدر مضطرب و بے قرار ہوتی ہے۔

جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے، اس وقت پاکستان ایک ایسے خطرہ سے دوچار ہے جس سے اس کی ہستی مخدوش ہو رہی ہے۔ ایسے وقت میں ہماری اجتماعی جبلت کا تقاضا ہونا چاہیئے تھا کہ ہم اس خطرہ کے مقابلے کے لئے، اپنی تمام قوتوں کو مجتمع کر کے ایک مرکز پر کھڑے ہو جاتے۔ ہمارے تمام اختلافات ختم ہو جاتے۔ ذاتی مقاصد پس پشت ڈال دئے جاتے گروہ بندانہ مفاد فراموش کر دئے جاتے۔ افراد کے خلاف شکوے، شکایات، بھلا دئے جاتے۔ ہر ایک کے سامنے یہی ایک مقصد ہوتا اور اس مقصد کے حصول کے لئے، تمام قوتیں اور صلاحیتیں وقف کر دی جاتیں۔

لیکن اس کے برعکس، جو کچھ ہمارے ہاں ہوا (اور ہو رہا ہے) اس پر جس قدر بھی خون کے آنسو بہائے جائیں کم ہیں۔ (مثلاً) حکومت نے، ایسے نازک موقع پر کچھ فیصلہ کرنے سے پہلے ضروری سمجھا کہ نمایندگانِ قوم سے فوری مشورہ لیا جائے۔ اس مقصد کے لئے اس نے پارلیمان کا خصوصی اجلاس طلب کیا۔ مرکزی پارلیمان کا یہ اجلاس قریب ایک ماہ تک مصروف کار رہا۔ اتفاق سے انہی دنوں مغربی پاکستان کی صوبائی اسمبلی کا اجلاس بھی سرگرم عمل تھا۔ ان دونوں اسمبلیوں کی کارروائی ہر روز اخبارات میں آتی رہی ہے۔ آپ اس کارروائی پر بہ حیثیت مجموعی نظر ڈالئے، یوں دکھائی دے گا جیسے یہ لوگ بدیا کھی کا میلہ دیکھنے آئے تھے۔ ان سے پوچھئے کہ جس خطرہ کے پیش نظر، آپ حضرات کو اس خصوصی اجلاس میں شمولیت کی زحمت دی گئی تھی، اس کے مقابلہ کے لئے آپ نے کیا سوچا اور قوم کو کیا راہ نمائی دی؟

یہ کچھ پارلیمانی نمایندگان کی طرف سے ہوا۔ جو لوگ اسمبلیوں سے باہر تھے، ان کی طرف سے جو کچھ ظہور میں آیا، وہ بھی کسی سے چھپا ڈھکا نہیں۔ حرام جو کسی کی طرف سے کوئی تجویز ایسی پیش کی گئی ہو جس سے اس خطرہ کا ازالہ ہو سکے۔ کسی نے کوئی مشورہ ایسا دیا ہو جو اس مسئلہ کے حل کی طرف راہ نمائی کر سکے۔ یہ تمام لیڈر حضرات، باہمی جوڑ توڑ میں لگے ہیں کہ کس طرح ایسی صورت پیدا کی جائے جس سے حکومت کی کرسیاں ہمارے قبضہ میں آجائیں۔ ان کے سامنے اس سے زیادہ اہم سوال کوئی نہ تھا کہ کس طرح فریق مقابل کو کمزور اور اپنی پارٹی کو طاقتور بنایا جائے — جلسے ہوئے۔ جلوس نکلے۔ بیانات شائع ہوئے۔ تقریریں کی گئیں۔ گالم گلوچ، بلکہ سر پھٹول تک نوبت پہنچی — یہ سب کس مقصد کے لئے؟ صرف اس مقصد کے لئے کہ کسی نہ کسی طرح حصولِ اقتدار کے راستے ہموار کئے جائیں — اور یہ کچھ کس وقت ہو رہا ہے؟ عین اس وقت جب ملک پر ہر طرف سے خطرات کے گھنے بادل امڈے چلے آ رہے ہیں اور اس کی سرحدوں پر دشمن کے سپاہی چلتے پھرتے دکھائی دے رہے ہیں۔

روم جل رہا ہے اور نیرو بانسری بجا رہا ہے۔

کوئی عہد کہن کا افسانہ نہیں۔ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی رہتی ہے۔

اس سارے ہنگامے میں سب سے زیادہ تاسف انگیز اور مایوس کن کردار ان لوگوں کا سامنے آیا جو قوم سے صبح شام یہ وعظ کرتے رہتے ہیں کہ ہماری ہر مشکل کا حل اسلام پیش کرتا ہے۔ ہماری نجات اس کے ساتھ وابستہ ہے۔ ہماری تباہی اور

بربادی کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہم نے اسلام کو چھوڑ رکھا ہے۔ اور ہماری تمام بیماریوں کا علاج یہ ہے کہ ہم اسلام پر کاربند ہو جائیں۔ اگر ہم اسلام کا دامن تھام لیں تو دنیا کی کوئی قوم ہماری طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتی ـــــ قوم کی نگاہیں رہ رہ کر ان حضرات کی طرف اٹھ رہی تھیں کہ یہ بتائیں گے کہ اسلام اس خطرہ کا علاج کیا بتاتا ہے۔

انھوں نے اس مشکل کا جو حل پیش کیا وہ غور طلب ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ اسلام نام عقیدہ و عمل کا نام ہے۔ جہاں تک عقیدہ کا تعلق ہے۔

ہمیں غیروں پر بھروسہ کرنے کی پالیسی کو یکسر ترک کر دینا چاہیئے اور اس بات کا عزم بالجزم کرنا چاہیئے کہ اب ہم جھوٹے خداؤں کو چھوڑ کر ایک ایسی بلند و بالا ذات پر بھروسہ کریں گے جو اس دنیا میں قوت اور طاقت کا حقیقی سرچشمہ ہے اور جس کے ساتھ رشتۂ عبودیت استوار کر لینے کے بعد ہم پر کبھی بھی ذلت اور مسکنت مسلط نہیں ہو سکتی۔

اس عقیدہ کے بعد قوم کرے کیا! ارشاد ہے۔

اس ضمن میں پہلی چیز جس کا اہتمام نہایت ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اس خطۂ پاک کی نمائندگی کا فرض صرف ان لوگوں کو سونپا جائے جو فکر و عمل اور سیرت و کردار کے اعتبار سے صحیح معنوں میں مسلمان ہوں۔

اور "صحیح معنوں میں مسلمان" ان حضرات کے سوا کوئی اور ہے نہیں۔ لہٰذا قوم کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ ملک کی زمامِ اقتدار ان حضرات کے ہاتھوں میں دیدی جائے۔ یہ کر دیجئے تو ملک ہر قسم کے خطرات سے مامون و مصئون ہو جائے گا ـــــ حکومت انہیں دے دیجئے اور آپ اللہ پر بھروسہ رکھئے۔ اس کے بعد سب خیریت ہے۔

ایک ماہرِ فنونِ جنگ نے ایک دفعہ کہا تھا کہ قومی نقطۂ نگاہ سے اب ملکوں کی حالت ایک انڈے کی سی ہے۔ فوج اس انڈے کا چھلکا ہوتی ہے۔ اور سول آبادی اس کی زردی سفیدی۔ اگر انڈا اُبلا ہوا ہے اور اس طرح اس کی زردی سفیدی میں پختگی آچکی ہے تو اس کا چھلکا ہر ٹھوکر کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ لیکن اگر انڈا کچا ہے تو اس کا چھلکا ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹ سکتا ہے۔ لہٰذا کسی ملک کی حقیقی قوت کا راز اس کی سول آبادی میں مضمر ہوتا ہے ـــ اگر یہ تجزیہ درست ہے ـــــ اور اس کے درست ہونے میں کیا کلام ہو سکتا ہے ـــ تو ہمارے کرنے کا کام یہ ہے کہ ہم اپنی فوجی قوت کے استحکام کے ساتھ، ملک کی شہری آبادی (CIVIL POPULATION) میں پختگی پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ ملک کی شہری آبادی بہ حیثیت مجموعی دو طبقات پر مشتمل ہے۔ ایک طبقہ عوام، جو اس آبادی کے قریب نوے فی صد حصہ کو محیط ہے۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جسے عام طور پر ہوشمند، تعلیم یافتہ طبقہ (INTELLIGENTSIA) کہا جاتا ہے۔ اس وقت ہمارے عوام کی حالت یہ ہے کہ انہیں روٹی کی فکر نے بُری طرح

پریشان کر رکھا ہے۔ اگر انہیں صبح کو کچھ ملتا ہے تو شام کے کھانے کی فکر دامنگیر ہو جاتی ہے۔ ان کے اوقات اس بُری طرح سے تلخ گزر رہے ہیں کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ زندگی کے دن کس طرح پورے کئے جائیں۔ وہ شہر میں ہوں یا دیہات میں، یہ فکر کسی جگہ بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ ان کے بال بچے ان کے سر پر بوجھ ہیں اور وہ خود دھرتی کے سینہ پر بوجھ۔ روزمرہ کی ضرورت کی چیزیں اس قدر گراں ہوتی جا رہی ہیں کہ ان کی قلیل سی آمدنی ان کی کسی طرح کفالت نہیں کر سکتی۔ کسی کو روٹی ملتی ہے تو کپڑا نہیں، کپڑا ملتا ہے تو دوائی کے لئے پیسے نہیں۔ بچوں کا پیٹ بھرنا ہی مشکل ہو جاتا ہے، انہیں تعلیم کہاں سے دلوائی جائے؟ آپ سوچئے کہ جس ملک کی نوے فیصدی آبادی اسی فکر میں غلطاں و پیچاں ہو، اسے زندگی کے کسی بلند مقصد کے لئے سوچنے کی فرصت کیسے مل سکتی ہے؟ اندیشے کی اس سفیدی میں پختگی پیدا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ

(۱) اگر سردست حکومت تمام افراد مملکت کو بنیادی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کا ذمہ نہیں لے سکتی تو کم از کم روزمرہ کی ضروریات کی چیزوں کی قیمتیں اتنی کم کر دے کہ انہیں ایک مزدور بھی باسانی خرید سکے۔

(۲) ان چیزوں میں ملاوٹ کو ایسا سنگین جرم قرار دیا جائے جس کی سزا پبلک میں کوڑے لگانا ہو۔ یاد رہے کہ جرم سے باز رکھنے والی سزا، بدنی سزا ہوتی ہے۔

(۳) عوام کے لئے سب سے پریشان کن مصیبت رشوت ہے۔ یہ ناسور ایسا ہے جس کا علاج آپریشن کے سوا کچھ نہیں۔ اس کا کلی تدارک تو اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کو ذاتی جائداد بنانے کی اجازت نہ ہو، لیکن جب تک یہ نہ ہو سکے، اس جرم کی سزا بھی پبلک میں کوڑے لگانا مقرر کی جائے۔

سردست اگر اس سے ابتدا کی جائے تو آپ دیکھئے گا کہ ملک کی اس کثیر آبادی میں، پاکستان کی خاطر مٹنے کا ولولہ کس قدر بیدار ہو جاتا ہے۔

باقی رہا ملک کا ہوشمند (تعلیم یافتہ) طبقہ، تو اس کے سامنے پاکستان کا بلند نصب العین اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ مسئلہ جس قدر اہم ہے اسی قدر غور و فکر کا محتاج بھی۔ یہ ظاہر ہے کہ پاکستان کا نصب العین اسلام کے سوا کچھ اور ہو نہیں سکتا لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت کی طرف سے اسلام کا جو تصور ان کے سامنے پیش کیا جاتا ہے، یہ اس سے بے حد خائف ہیں اور سوچتے ہیں کہ اگر اس ملک میں معاشرہ کا یہی نقشہ مرتب ہونے والا ہے تو یہاں زندگی کا دم گھٹ جائے گا۔ ان کے سامنے اس اسلامی نظام کا نقشہ اس انداز کا پیش کیا جاتا ہے:

> میرے نزدیک اس کا حل یہ ہے کہ جس علاقہ میں اسلامی انقلاب رونما ہو وہاں مسلمان آبادی کو نوٹس دے دیا جائے کہ جو لوگ اسلام سے اعتقاداً و عملاً منحرف ہو چکے ہیں اور منحرف رہنا چاہتے ہیں، وہ تاریخ اعلان سے ایک سال کے اندر اندر اپنے غیر مسلم ہونے کا باقاعدہ اظہار کر کے ہمارے نظم جماعت سے باہر نکل جائیں۔ اس مدت کے بعد ان سب لوگوں کو جو مسلمان کی نسل سے پیدا ہوئے ہیں مسلمان سمجھا جائے گا۔ تمام قوانین اسلامی ان پر نافذ کئے جائیں گے۔ فرائض و واجبات دین کے التزام پر انہیں مجبور کیا جائے گا اور پھر جو کوئی دائرہ اسلام سے

باہر قدم رکھے گا اسے قتل کر دیا جائے گا۔

اس بات کا فیصلہ کہ

(۱) وہ کون لوگ ہیں جو اسلام سے اعتقاداً اور عملاً منحرف ہو چکے ہیں۔

(۲) وہ قوانین کون سے ہوں گے جو ان پر نافذ کئے جائیں گے۔

(۳) وہ فرائض و واجبات کیا ہیں جن کے التزام پر انہیں مجبور کیا جائے گا۔

(۴) وہ اسلام کون سا ہے جس کے دائرے سے باہر قدم رکھنے والوں کو قتل کر دیا جائے گا۔

یہ حضرات کریں گے۔ اور اس سلسلہ میں ان قتل ہونے والوں کو مہلت تک بھی نہیں دی جائے گی۔

> جو لوگ ... مسلمانوں کے اندر سے خدا کے قانون سے بغاوت کرتے ہیں ظاہر ہے کہ یہ ذمیوں میں شمار نہیں ہوں گے۔ لازماً ان لوگوں میں شمار ہوں گے جن پر حق واضح ہو چکا ہو یا جن کے لئے وضاحتِ حق کے تمام وسائل موجود ہیں۔ ... اب اگر وہ خدا کے قانون سے بغاوت کرتے ہیں تو آخر خدا کا قانون ان کو کس غرض کیلئے مہلت دیگا۔ اب ان کی ہدایت کیلئے کس چیز کا انتظار باقی ہے۔ ان لوگوں کو سورۂ مائدہ کی آیت اِنَّمَا جَزَآءُ الَّذِیْنَ ... کی رُو سے امام قتل کر دینے کا مجاز ہو گا۔

یہ "قانونِ خداوندی" کیا ہوگا اس کا فیصلہ بھی یہی حضرات کریں گے۔

آپ سوچئے کہ جس "اسلام" میں یہ کچھ ہونے والا ہو اسے عملاً متشکل دیکھنے کے لئے کتنے دلوں میں ولولے بیدار ہوں گے؟

اور اس کے ساتھ ہی آپ اس پر بھی غور کیجئے کہ

(۱) جس مملکت کا نصب العین یہ ہو کہ اس میں اسلامی نظام متشکل ہوگا ——— اور

(۲) اسلامی نظام کا تصور وہ ہو جس کی ایک جھلک اوپر پیش کی گئی ہے۔

اس ملک کی سالمیت اور حفاظت کے لئے کتنے لوگ کسی ایثار و قربانی کے لئے تیار ہو سکیں گے؟ اس اسلام کو ملک کا نصب العین قرار دیجئے جسے خدا نے اپنے رسولؐ پر نازل کیا تھا تو دیکھئے لوگ (اپنے ہی نہیں بلکہ بیگانے بھی) کس طرح اس کے گرد پروانہ وار جمع ہوتے ہیں۔ لیکن اس "چنگیزیت" کو اسلام کے نام سے ملک پر مسلط کرنے کی کوشش کیجئے تو اسلام کا رہا سہا احترام بھی رخصت ہو جائے گا۔ اور لوگ اس سے دور بھاگنے لگیں گے ——— یہ کچھ ابھی سے ہونا شروع ہو گیا ہے۔ یاد رکھئے۔ اس ملک کے لئے اصلی خطرہ نہرو نہیں۔ اصلی خطرہ اس تصور کا اسلام ہے جس سے ہر شریف آدمی خائف ہے۔ جب تک آپ لوگوں کے دل سے اس خوف کو دور نہیں کریں گے پاکستان سے والہانہ محبت پیدا نہیں ہو سکے گی۔ اس لئے ضروری ہے کہ لوگوں کے سامنے صحیح اسلام لایا جائے اور انہیں بتایا جائے کہ اس اسلام کے تحت زندگی بسر کرنے سے انہیں کس قدر سکون، اطمینان، مرفہ الحالی، عزت، تکریم اور آزادی حاصل ہو گی۔

لیکن اگر ان حالات کو جو ملک میں رونما ہو چکے ہیں علیٰ حالہٖ رہنے دیا گیا اور ان قوتوں کو جو اسلام کے نام پر ملک میں انتشار پیدا کئے چلی جا رہی ہیں اسی طرح آگے بڑھنے دیا گیا، تو ملک اس اندرونی خطرہ کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔

ہمارا خیال ہے کہ حکومتِ پاکستان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس امر کی وضاحت کرے کہ اُس اسلام کے بنیادی تصورات، اصول اور حدود کیا ہوں گے جسے اس ملک کا نصب العین قرار دیا گیا ہے۔ ورنہ جن تخریب پسند قوتوں نے اس وقت پراپیگنڈہ کی مشینری پر قبضہ کر رکھا ہے، وہ ملک میں، اسلام کے نام پر، خوف اور ہراسانی کی فضا عام کرتی چلی جائیں گی۔ اس کا جو انجام ہو سکتا ہے وہ کسی دیدۂ بینا سے پوشیدہ نہیں۔

معصوم بچوں کا اغوا اور اس سنگین جرم کی سزا

ننھے اور معصوم بچوں کا اغوا ایسا بھیانک جرم ہے جس کے تصور سے قلبِ حساس لرز اٹھتا ہے۔ ہمارے ملک میں اس سے قبل شاذ و نادر ہی اس قسم کے واقعات سننے میں آتے تھے۔ لیکن گزشتہ چند سالوں میں اس جرم نے ایک منظم اور ملک گیر مہم کی سی صورت اختیار کر لی ہے اور آئے دن ایسی روح فرسا خبریں سننے میں آتی رہتی ہیں کہ فلاں صاحب کا بچہ اسکول گیا اور پھر واپس نہیں آیا۔ فلاں بچی اپنے گھر کے سامنے گلی میں کھیل رہی تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے نگاہوں سے اوجھل ہو گئی اور پھر اس کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ معاشرہ میں اس قسم کے سنگین واقعات کی بھرمار ہے۔ پولیس عام طور پر ان حادثوں کا سراغ لگانے میں ناکام رہتی ہے اور معاشرتی زندگی میں اس کے جو ہیجان خیز اور اضطراب انگیز اثرات مرتب ہوتے ہیں انہیں ضبطِ تحریر میں لانا ممکن نہیں۔ یہ وہ صورتِ حال ہے جو ہمارے معاشرہ کی زندگی میں تلخ ترین تلخیوں کو جنم دئے چلی جا رہی ہے۔

سوچئے کہ جو معاشرہ اس قسم کے سنگین جرائم کی شکارگاہ بن جائے جہاں انسانی روپ میں سینکڑوں درندوں کے منظم گروہ اپنے شکار کی تلاش میں آزادی سے پھر رہے ہوں۔ اور جگہ بہ جگہ اس تاک میں لگے ہوں کہ کسی نہ کسی باپ کی آنکھوں کا نور اچک کر لے جائیں۔ اور کسی نہ کسی ماں کے دل کا سرور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھین لیں، وہاں انسانی زندگی کے چین اور اطمینان کو کیسے ہوشربا اور سکون سوز خطرات لاحق ہوں گے اور ان خاندانوں کی کیفیت کیا ہو گی جن کے جگر پاروں کو ان سنگدلوں نے اس بے دردی اور بربریت سے اُچک لیا کہ ان بدنصیبوں کے مستقبل کے بارے میں کوئی اندازہ تک کرنا ممکن نہیں۔ یہ ہمارے معاشرہ کے وہ مہلک اور رستے ہوئے ناسور ہیں جن کا اندمال نہیں ہو سکتا۔ یہ وہ زخم ہیں جن کی کسک حرماں نصیب والدین کو زندگی کے آخری سانس تک ماہیٔ بے آب تڑپائے رکھتی ہے۔

سنگینیٔ حالات کی اس مذموم کیفیت کا اندازہ طلوعِ اسلام نے دو ڈھائی سال قبل ہی لگا لیا تھا اور معاشرہ کو اس

کی نارواتلخیوں اور ان کی بڑھتی ہوئی شدت سے بچانے کے لئے اس نے ستمبر ۱۹۶۱ء کے شمارہ میں "حقائق وعبر" کے زیر عنوان پیدا شدہ تاثرات کا تجزیہ کرنے کے بعد، آخر میں لکھا تھا کہ

اس جرم کی سزا موت ہونی چاہیئے

اور سزائے موت، متعلقہ گروہ میں سے ایک فرد کو نہیں بلکہ گروہ کے تمام افراد کے لئے۔ جو مجرم ہمارے ہاں سے کپڑے کی گٹھڑی اغوا کر کے "واگہ پار لے جانے کی کوشش کرے، اگر اسے گولی سے اڑایا جا سکتا ہے تو جو درندہ معصوم بچے کو اغوا کرے اُسے حوالۂ دار و رسن کیوں نہ کیا جائے۔"

لیکن افسوس ہے کہ ہماری یہ پکار صدا بصحرا ثابت ہوئی اور مروجہ قانون میں کوئی تبدیلی نہ کی گئی۔ لیکن ابھی ابھی صوبائی اسمبلی کے حالیہ سیشن کے دوران، اخبارات کی یہ اطلاع ہمارے لئے بڑی خوش آیند اور باعث اطمینان و مسرت تھی کہ صوبائی اسمبلی کے ایک معزز رکن نے بجا طور پر فرض شناسی کا ثبوت مہیا کیا اور تعزیرات پاکستان میں ترمیم کا مسودہ قانون پیش کرتے ہوئے بچوں کے اغوا کے اس سنگین جرم کے لئے وہی سزا تجویز کی جس کا مشورہ دو ڈھائی سال پہلے طلوع اسلام نے دیا تھا ——— یعنی موت کی سزا۔ یہ مسودۂ قانون کراچی کے محترم نجم الدین ولیکا کی طرف سے پیش کیا گیا ہے اور اسمبلی کا آیندہ اجلاس اس کے متعلق فیصلہ کرے گا۔

طلوع اسلام صوبائی اسمبلی کے اس معزز رکن کے احساس فرض پر اطمینان و مسرت کا اظہار کرتا ہے۔ یقیناً یہ مسودۂ قانون پاکستان کے ہر مخلص اور امن پسند شہری کی آرزوؤں کا آئینہ دار ثابت ہوگا، اور پورے ملک کے متفقہ مطالبے کی ترجمانی قرار پائے گا۔ ہم امید کرتے ہیں کہ صوبائی اسمبلی کے اراکین کامل اتفاق رائے سے اس مسودۂ قانون کی تائید کریں گے۔

یہ شذرہ لکھا جا چکا تھا کہ اخبارات میں یہ خبر آئی کہ اس مسودہ کو واپس لے لیا گیا ہے کیونکہ حکومت نے یقین دلایا ہے کہ وہ خود آیندہ سیشن میں، ان امور کے متعلق ایک جامع مسودۂ قوانین پیش کرنے والی ہے۔ یہ مسودہ جتنی جلد پاس ہو جاتا اتنا ہی اچھا تھا۔ بہر حال ہمیں امید ہے کہ حکومت آیندہ سیشن میں اپنے مسودہ کو ضرور پیش کر دے گی۔ ایسے معاملات میں التوا اور تاخیر مزید خرابیوں کا موجب ہوتا ہے۔

کراچی کے دوستو!
آیئے اور ہر اتوار کی صبح کو سندھ اسمبلی ہال (بندر روڈ) میں مفکر قرآن محترم پرویز صاحب کی زبان میں سنئے کہ قرآن عصر حاضر کے چیلنج کا علی وجہ البصیرت کیا جواب دیتا ہے اور زندگی کے درپیش مسائل کا کس قدر دلنشیں اور دلکش حل پیش کرتا ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اولیاء اللہ کون ہیں؟

(پرویز)

"اولیاء اللہ" کے الفاظ سنتے ہی ہمارا ذہن ایک خاص گروہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، جو عام انسانوں ہی سے نہیں بلکہ جماعتِ مومنین سے بھی منفرد اور الگ ہے۔ ان کی خصوصیات ایسی ہیں جو دوسرے مسلمانوں میں نہیں پائی جاتیں۔ ان کی تعلیم الگ۔ ان کی "عبادت" (ریاضت) کے طور طریق مختلف۔ ان کا رہن سہن باقی لوگوں سے جداگانہ۔ وہ غیب کی باتیں جانتے ہیں۔ دوسروں کے دل کے حالات تک سے واقف ہیں۔ ہر آنے والے کے متعلق پہلے ہی جان لیتے ہیں کہ وہ کیا مانگنے کے لئے آیا ہے۔ ہونے والے واقعات سب ان کی آنکھوں کے سامنے رہتے ہیں۔ وہ جو کچھ زبان سے کہتے ہیں ہو جاتا ہے۔

اولیاء اللہ کی خصوصیات

وہ لوگوں کی مرادیں پوری کرتے ہیں۔ بگڑی بنا دیتے ہیں۔ تقدیریں بدل دیتے ہیں۔ قسمت کا لکھا مٹا دیتے ہیں۔ ان کا غصہ تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ ان کی خوشنودی دنیا اور آخرت سنوار دیتی ہے۔ انہوں نے جس کی طرف نگاہِ کرم سے دیکھ لیا اس کا بیڑا پار ہو گیا۔ جس سے رُخ پھیر لیا، وہ کہیں کا نہ رہا۔ ان کا ماننے والا جہاں بھی انہیں پکارے وہ اس کی سنتے ہیں، اس کی پکار کا جواب دیتے ہیں اور اس کی مدد کو پہنچتے ہیں۔ ان سے ایسی ایسی کرامات سرزد ہوتی ہیں جن سے عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ وہ جب تک جی چاہے دنیا میں رہتے ہیں جب چاہیں یہاں سے پردہ کر لیتے ہیں۔ (وہ مرتے نہیں صرف لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ اس لئے جو کچھ وہ دنیا میں ہوتے ہوئے لوگوں کے لئے کرتے تھے۔ وہی کچھ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو کر کرتے ہیں) وہ مرنے کے بعد بھی لوگوں کی دعائیں بدستور سنتے ہیں۔ ان کی مرادیں پوری کرتے ہیں۔ ان کی مدد کو پہنچتے ہیں۔ وہ جیتے جی بھی دربارِ خداوندی میں جاتے تھے، مرنے کے بعد بھی وہیں ہوتے ہیں۔ محکمۂ قضا و قدر کی طرف سے، دنیا کا نظم و نسق ان کے سپرد ہوتا ہے۔ جس طرح دنیاوی حکومت کی طرف سے مختلف کارپردازان مقرر ہوتے ہیں ــــ

گورنر، کمشنر، ڈپٹی کمشنر، سپرنٹنڈنٹ پولیس وغیرہ ـــ اسی طرح محکمۂ قضا وقدر کی طرف سے دنیاوی امور کا انتظام و انصرام "اولیاء اللہ" کے سپرد ہوتا ہے۔ ان کے بھی مختلف مدارج و مناصب ہوتے ہیں اور انہی کے اعتبار سے مختلف امورِ مملکت ان کے سپرد کئے جاتے ہیں۔ ظاہری حکومت کے کارندے ـــ گورنر کمشنر وغیرہ یوں ہی کٹھ پتلیاں ہوتے ہیں، جو ان حقیقی کارپردازانِ قضا وقدر کے فیصلوں کی تعمیل کرنے پر مامور ہوتے ہیں۔ غرضیکہ کائنات کا سارا نظم ونسق انہی کے سپرد ہوتا ہے۔ اور جو کچھ ہوتا ہے سب انہی کے اشاروں سے ہوتا ہے۔ جب ان کا کوئی معتقد مرنے کے بعد قبر میں منکر نکیر کے عذاب سے ڈر کر ان کی دہائی دیتا ہے تو یہ وہاں بھی اس کی مدد کو پہنچتے ہیں اور جب قیامت میں ہر طرف نفسا نفسی ہوگی تو یہ اپنے مریدوں کو، سیدھے جنت میں لے جائیں گے۔

اس گروہ کے، عام جماعتِ مومنین سے الگ اور منفرد ہونے کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جب "اولیاء اللہ" کہا جاتا ہے تو کسی کا خیال نہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی طرف جاتا ہے نہ عمر فاروقؓ کی طرف۔ نہ خالد سیف اللہؓ اس زمرہ میں شریک دکھائی دیتے ہیں۔ نہ عمرو بن العاصؓ۔ ان کی اہمیت کا یہ عالم ہے کہ (مثلاً) ان کے عرسوں کی تاریخیں ہر وقت، ہر شخص کی نگاہوں کے سامنے رہتی ہیں۔ لیکن اگر آپ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی تاریخ وفات یا حضرت عمرؓ کے سنِ شہادت کے متعلق دریافت کریں تو شاید سَو میں سے دس مسلمان بھی نہ بتا سکیں۔ ان کے مزارات کی عظمت کی یہ کیفیت ہے کہ ایک ایک قبر پر لاکھوں روپے کی عمارات قائم ہوں گی۔ اور ہزاروں روپے کے غلاف سالانہ پڑھتے ہوں گے۔

صحابہؓ کا شمار بھی ان میں نہیں ہوتا

لیکن اس کا علم شاید ایک فی صد مسلمانوں کو بھی نہ ہو کہ (مثلاً) حضرت عثمانؓ کہاں دفن ہوئے تھے اور ان کے مزار کی آج کیا حالت ہے؟ حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کی کسی کرامت کا ذکر تک آپ نے کہیں سے نہیں سنا ہوگا۔ لیکن سائیں "گھوڑے شاہ" اور "کھنڈی شاہ" کی کرامات کے چرچے ہر خاص و عام کی زبان پر ہوں گے۔ آپ نے کبھی کسی کو یہ کہتے نہیں سنا ہوگا کہ میں حضرت عمرؓ کی نیاز دے رہا ہوں۔ اس کے برعکس "حضرت شاہ لکھی" کی نیاز کی دیگوں کی آواز ہر تیسرے دن سنائی دے گی۔

"اولیاء اللہ" کے اس خاص گروہ کا تصور جہلا تک ہی محدود نہیں۔ مسلمانوں کا بلند پایہ علمی طبقہ ـــ خواہ وہ علوم شریعت کے حامل ہوں، یا دنیاوی علوم کے ماہر۔ ان کی ان خصوصیات کا معترف اور ان کی جداگانہ ہستی کا قائل ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کوئی اس میں ذرا مبالغہ سے کام لیتا ہے کوئی اعتدال پر رہتا ہے۔ لیکن اس جداگانہ گروہ کے قائل سب ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا قرآن کریم بھی اس قسم کے کسی الگ گروہ کا ذکر کرتا ہے اور ان کی وہ خصوصیات بتاتا ہے جن

کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں "ولی" کا لفظ آیا ہے۔ اور "اولیاء" کا بھی ــــ بلکہ "اولیاء اللہ" کا بھی۔ اس لئے ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ ان الفاظ کے معنی کیا ہیں اور قرآن انہیں کن لوگوں کے لئے استعمال کرتا ہے۔

ولی کے معنی

اَلْوَلِیُّ کے بنیادی معنی ہیں کسی کے قریب اور نزدیک ہونا۔ قرب کے اعتبار سے اَلْوَلِیُّ دوست اور مددگار کو کہتے ہیں۔ اِسْتَوْلٰی عَلَی الشَّیْءِ کے معنی ہیں کسی چیز کو اپنے قبضۂ قدرت میں لے لینا۔ کسی پر غالب آ جانا۔ اس اعتبار سے وَالِیْ نگران، ناظم، اور حاکم کو کہتے ہیں نیز اَلْوَلِیُّ بھی نگران اور حاکم کو کہتے ہیں۔

وَلِیَ کے متضاد معنی آتے ہیں یعنی کسی کی طرف رجوع کرنا بھی اور اس سے اعراض برتنا بھی۔ تَوَلّٰی عَنْہُ اس سے اعراض برتنا۔ تَوَلَّاہُ اس کی پیروی کرنا۔ اسے اختیار کرنا۔ اس اعتبار سے اَلْوَلِیُّ کے معنی اطاعت کرنے والا بھی ہوں گے۔

قرآن کریم میں۔

(۱) خدا کو مومنین کا ولی کہا گیا ہے۔

(۲) مومنین کو خدا کا ولی بتایا گیا ہے۔ اور

(۳) مومنین کو ایک دوسرے کا ولی کہا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ جب خدا کے متعلق کہا جائے گا کہ وہ مومنین کا ولی ہے تو اس کے بنیادی معنی نگران۔ سرپرست۔ حاکم۔ مطاع کے ہوں گے۔

اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُھُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ۔ وَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَوْلِیٰٓئُھُمُ الطَّاغُوْتُ یُخْرِجُوْنَھُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَی الظُّلُمٰتِ (۲/۲۵۷)

"اللہ ان لوگوں کا سرپرست۔ نگران، حاکم۔ مطاع ہے جو ایمان کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ انہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔ اس کے برعکس، جو لوگ کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں، ان کی سرپرست، نگران، حاکم، مطاع، غیر خداوندی سرکش قوتیں ہوتی ہیں جو انہیں روشنی سے نکال کر تاریکیوں کی طرف لے جاتی ہیں۔" اسی لئے قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ خدا کے سوا کسی اور کو اپنا "ولی" نہ بناؤ۔

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِیَآءَ فَاللّٰہُ ھُوَ الْوَلِیُّ وَ ھُوَ یُحْیِ الْمَوْتٰی ــــ (۴۲/۹)

"کیا ان لوگوں نے اللہ کے سوا اوروں کو "اولیاء" (سرپرست۔ آقا۔ حاکم۔ مطاع) قرار دے رکھا ہے۔ حالانکہ اللہ ہی ہے جو حقیقی سرپرست اور کارساز ہے۔ وہ مردوں تک کو زندگی عطا کر دیتا ہے۔ خدا کو ولیؔ یا مولیٰ تسلیم کرنے سے

ولی بمعنی مطاع

مراد یہ ہے کہ اطاعت صرف اسی کے قوانین کی کی جائے اس میں کسی اور کی محکومیت کو شریک نہ کیا جائے۔ سورۂ کہف میں ہے۔ مَا لَهُمْ مِّنْ دُونِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا۔ (۱۸/۲۶) اس کے سوا لوگوں کا کوئی ولی نہیں اور وہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔

خدا کی ولایت (سرپرستی۔ نگرانی۔ حفاظت) بھی اسی کو حاصل ہو سکتی ہے جو اس کے قوانین کی اطاعت کرے اور ان کے مقابلہ میں اپنے یا دوسروں کے جذبات اور خواہشات کا اتباع نہ کرنے لگ جائے۔ سورۂ بقرہ میں ہے۔ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى۔ ان سے کہہ دو کہ خدا کی طرف سے نازل شدہ ہدایت ہی ایسی ہے جو حقیقی معنوں میں ہدایت کہلانے کی مستحق ہے۔ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ——— (۲/۱۲۰) اگر تم نے ان لوگوں کے خیالات کا اتباع کر لیا، باوجودیکہ تمہارے پاس علم و یقین کی روشنی (وحیٔ خداوندی) آچکی ہے تو تم خدا کی ولایت و نصرت سے محروم ہو جاؤ گے۔ یعنی اس کی نصرت اور سرپرستی مشروط ہے۔ اس سے کہ انسان اس کی نازل کردہ وحی کے مطابق چلے۔

دوسرے مقام پر ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَرُدُّوْكُمْ عَلٰٓي اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ۔ بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَھُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ——— (۳/۱۴۹)

اے ایمان والو! اگر تم نے ان لوگوں کی اطاعت کی جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کر لی ہے تو یاد رکھو وہ تمہیں راہ حق سے اُلٹے پاؤں پھرا دیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم کامیابیوں کے راستے پر گامزن ہو جانے کے بعد پھر تباہیوں کے جہنم میں جا گرو گے۔ یہ لوگ تمہارے کارساز اور مطاع نہیں ہو سکتے۔ تمہارا کارساز اور مطاع۔ حامی و ناصر صرف خدا ہے۔ تم اسی کی اطاعت اختیار کرو۔

یہ اطاعت صرف قرآن کریم کی ہے۔ اس کے سوا کسی کی اطاعت اور اتباع جائز نہیں۔

اطاعت قرآن کی ہے

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ۔ (۷/۳)

جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے نازل ہوا ہے اس کا اتباع کرو۔ اور اس کے علاوہ اپنے خود ساختہ

مطاعوں کا اتباع مت کرو۔ (یہ بڑی واضح بات ہے) لیکن بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ تم اس
حقیقت کو نگاہ کے سامنے رکھو (تم اوروں کی اطاعت کرنے لگ جاتے ہو)
ان مقامات سے واضح ہے کہ خدا کو "اپنا ولی" تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے نازل کردہ قوانین کی اطاعت کی جائے۔

خدا اور بندے کا تعلق

لیکن یہ اطاعت (معاذاللہ) کسی مستبد حاکم کی اطاعت نہیں۔ اس سے خدا اور بندے میں باہمی رفاقت کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ (اور یہ ولایت کا دوسرا مفہوم ہے)۔
رفاقت کے معنی یہ ہیں کہ کائنات میں خدا کا ایک پروگرام جاری و ساری ہے۔ قوانین خداوندی کی اطاعت سے، انسان اس پروگرام کی تکمیل میں ممد و معاون ہو جاتا ہے۔ اور اس کے بدلے میں، خدا کی کائناتی قوتوں کی تائید و نصرت اس کے شامل حال ہو جاتی ہے۔ اس طرح خدا اور بندہ ایک دوسرے کے رفیق بن جاتے ہیں۔ سورۃ محمدؐ میں ہے۔ یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ یَنْصُرْكُمْ وَ یُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ۔ (۴۷/۷) اے ایمان والو اگر تم نے دین خداوندی کی مدد کی، تو خدا تمہاری مدد کرے گا۔ اور اس کی مدد کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہیں استقامت نصیب ہو جائے گی۔ تمہارے پاؤں جم جائیں گے۔ یوں خدا اور بندہ ایک دوسرے کے رفیق بن جاتے ہیں۔

اب ہم اس موضوع کے دوسرے گوشے کی طرف آتے ہیں — اور یہی گوشہ اس وقت بنیادی طور پر ہمارے پیش نظر ہے۔ یعنی جب کسی انسان کو "ولی اللہ" یا انسانوں کی جماعت کو "اولیاء اللہ" کہا جائے تو اس سے کیا مراد ہوتی ہے۔

مومن ہی اولیاء اللہ ہیں

قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ یہ مومن اور متقی ہی ہوتے ہیں۔ ان سے الگ ان کا کوئی اور گروہ نہیں ہوتا۔ یعنی مومن اور متقی کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قوانین خداوندی کے مطیع و فرماں پذیر اور اس کے دین کی مدد کرنے والے ہوتے ہیں۔ بالفاظ دیگر جس طرح صالح، شہید صدیق ہونا، مومن کی صفات ہیں۔ اسی طرح اس کا "ولی اللہ" ہونا بھی اس کی ایک صفت اور خصوصیت ہے۔ چنانچہ سورۃ یونس میں ہے۔

اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ (۱۰/۶۲)

سن رکھو! کہ اولیاء اللہ کو نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔

آپ قرآن کریم کے اوراق پر نگاہ ڈالئے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ مومنین کی صفت بتائی گئی ہے۔ اور یہ نتیجہ ہے ہدایت خداوندی کے اتباع کا۔ چنانچہ سورۃ بقرہ کے شروع ہی میں نوع انسان کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ

فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (۲/۳۸)

تمہارے پاس میری طرف سے راہ نمائی آتی رہے گی۔ سو جو لوگ میری راہ نمائی کا اتباع کرینگے انہیں نہ کسی قسم کا خوف ہو گا نہ حزن۔ اسی سورہ میں ذرا آگے چل کر ہے۔ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۲/۶۲) جو بھی اللہ اور آخرت پر ایمان لائے اور صلاحیت بخش کام کرے تو ان لوگوں کا اجر ان کے رب کے ہاں سے ملے گا۔ اور وہ اجر یہ ہے کہ انہیں نہ کسی قسم کا خوف ہو گا نہ حزن۔ اس سے بھی واضح ہے کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ——— کی خصوصیت مومنین کے کسی خاص گروہ کی نہیں سارے مومنین کی خصوصیت ہے۔

ان تصریحات کے بعد پھر سورہ یونس کی اس آیت کی طرف آئیے جسے اوپر درج کیا گیا ہے۔ اور دیکھئے کہ اس سے اگلی آیت نے کس طرح اس حقیقت کی وضاحت کر دی ہے کہ "اولیاء اللہ" مومنین سے الگ کوئی جماعت نہیں — جو آیت پہلے درج کی گئی ہے وہ یہ ہے أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ — سن رکھو کہ اولیاء اللہ کو نہ کسی قسم کا خوف ہو گا نہ حزن۔ اس کے بعد ہے۔ الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ۔ (۱۰/۶۳) یعنی ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انہوں نے قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کی۔ یہاں دیکھئے قرآن کریم نے کس طرح اولیاء اللہ کی تشریح یہ کہہ کر کر دی کہ الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ — یعنی یہ مومنین اور متقین ہی کا دوسرا نام ہے۔ ان سے الگ کوئی گروہ نہیں۔ یہ بھی نہیں کہ مومن اور متقیوں میں سے بعض اولیاء اللہ ہو جاتے ہیں۔ اور باقی صرف مومن اور متقی رہتے ہیں۔ ہر تقویٰ شعار مومن ولی اللہ ہوتا ہے۔ یعنی خدا کا مطیع و فرماں بردار۔ اس کا رفیق۔

ہمارے ہاں اولیاء اللہ کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ وہ فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ پھٹے ہوئے کپڑے۔ ایک کمبل یا گدڑی اوڑھنے بچھونے کو۔ دنیا کی تمام لذات اور حظائظ سے کنارہ کشی۔ ہر خوش گوار شے سے نفرت۔ ایک بہت بڑے "ولی اللہ" حضرت فضیل ابن عیاضؒ ——— کے الفاظ میں ان کا مسلک یہ ہوتا ہے کہ

> اگر دنیا اس کی تمام دلچسپیوں کے ساتھ مجھے دیدی جائے اور اس پر کسی محاسبہ کا اندیشہ بھی نہ ہو تب بھی میں اسے ایسا ہی ناپاک سمجھوں گا جیسے تم مُردار کو ناپاک سمجھتے ہو۔

اولیاء اللہ کی دنیاوی زندگی

لیکن قرآن کہتا ہے کہ ان اولیاء اللہ ——— یعنی مومنین متقین کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ۔ ان کے لئے اس دنیا کی زندگی میں بھی ہر طرح کی خوش خبریاں ہیں اور آخرت کی زندگی میں بھی۔ یعنی انہیں اس دنیا کی زندگی میں بھی ہر قسم کی خوشگواریاں اور مرفہ الحالیاں حاصل ہوں گی۔ اور اُخروی زندگی میں بھی کامیابیاں اور کامرانیاں۔ اور یہ بات محض ہنگامی اور اتفاقی نہیں ہو گی۔ نہ ہی یہ کہ ان میں سے بعض کو یہ حاصل ہوں اور دوسروں کو نہ ہوں۔ قرآن

کہتا ہے کہ یہ خدا کا اٹل قانون ہے کہ ایسا ہوگا۔ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ اور خدا کے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ ایسا ہمیشہ ہوگا۔ اولیاء اللہ۔ یعنی جماعت مومنین کی دنیاوی زندگی بھی خوشگواریوں کی ہوگی اور اُخروی زندگی بھی۔ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ــــ (۱۰/۶۴) اور یہ بہت بڑی کامیابی و کامرانی ہے۔

نزولِ ملائکہ

"اولیاء اللہ" کے متعلق یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ ملاء اعلیٰ کے ساتھ ان کا خاص تعلق ہوتا ہے۔ ان پر خدا کے فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ بھی مومنین کے کسی خاص گروہ کی خصوصیت نہیں۔ تمام مومنین کے ساتھ ایسا ہوتا ہے اُن پر نزولِ ملائکہ ہوتا ہے۔ جو انہیں اس دنیا کی زندگی اور اُخروی زندگی میں خوشگواریوں کی بشارت دیتے ہیں۔ سورہ حٰم السجدہ میں ہے۔

إِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ أَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَأَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ــــ (۴۱/۳۰)

یقیناً وہ لوگ جنہوں نے کہہ دیا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اپنے اس ایمان پر جم کر کھڑے ہوگئے تو ان پر (سکون و طمانیت کے حامل) فرشتے نازل ہوتے ہیں (جو ان سے کہتے ہیں کہ) مت خوف کھاؤ۔ غمگین نہ ہو اور اس جنت کی بشارت سنو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔

وہ ان سے کہتے ہیں کہ

نَحْنُ أَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ أَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ــــ (۴۱/۳۱)

ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے رفیق اور دوست ہیں اور آخرت کی زندگی میں بھی۔ تمہارے لئے اس دنیا کی زندگی میں بھی وہ سب کچھ ہے جس کی تمہیں آرزو ہوگی اور اخروی زندگی میں بھی۔ تمہیں یہاں بھی وہ سب کچھ ملے گا جو تم مانگو گے۔ اور اُس زندگی میں بھی۔

اس سے ظاہر ہے کہ ایمان اور استقامت کا لازمی نتیجہ نزولِ ملائکہ ہے اور یہ کسی خاص گروہ کی خصوصیت نہیں۔ یہ جماعت مومنین کے لئے ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انہیں اس دنیا میں بھی وہ سب کچھ ملتا ہے جس کی وہ خواہش کرتے ہیں۔ اور آخرت میں بھی ایسا ہی ہوگا۔ مومن جو مانگے گا اسے ملتا ہے۔ اس دنیا میں بھی اور اُس دنیا میں بھی ـــ اس لئے کہ وہ مانگتا ہی وہ کچھ ہے۔ جو قوانین خداوندی کے مطابق مل سکتا ہے۔ وَمَا تَشَآءُوْنَ إِلَّآ أَنْ

ـــــ یَشَآءُ اللّٰہُ (۲۴/۵۵) ظاہر ہے کہ جب جماعت مومنین کو ان کے ایمان و عمل صالح کے نتیجہ میں استخلاف فی الارض حاصل ہو جائے گا تو ان کی ہر مانگ پوری کیوں نہیں ہوگی؟ واضح رہے کہ ان کی یہ مانگ کسی مافوق الفطرت طریقہ سے پوری نہیں ہوتی۔ فطرت کے قاعدوں کے مطابق پوری ہوتی ہے۔ وہ تسخیر فطرت کرتے ہیں۔ اور فطرت کی مسخر کردہ قوتوں کو قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کرتے ہیں۔ اس طرح ان کی ہر مانگ پوری ہوتی جاتی ہے۔ یہی نزول ملائکہ ہے۔ اشیائے فطرت کی تسخیر سے انہیں اس زندگی میں ہر قسم کی خوشگواریاں حاصل ہوتی ہیں اور چونکہ وہ ان قوتوں کی تقسیم قوانینِ خداوندی کے مطابق تمام نوع انسان کی مرفہ الحالی کے لئے کرتے ہیں۔ اس لئے ان کی آخری زندگی بھی کامرانیوں اور سرفرازیوں کی زندگی ہوتی ہے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

کمالِ ترک نہیں آب و گل سے مہجوری
کمالِ ترک ہے تسخیر خاکی و نوری

موت کی تمنا کرنے والے

قرآن کریم کی رو سے، مومن کی زندگی کا مقصود، مستقل اقدار کی حفاظت ہوتا ہے۔ جب کبھی ایسا ہو کہ کسی مستقل قدر اور اس کے ذاتی رجحان یا مفاد میں (TIE) پڑ جائے، تو وہ اپنے ذاتی رجحان یا مفاد کو مستقل قدر پر قربان کر دیتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر ایسا وقت آجائے کہ اسے کسی بلند مستقل قدر کے تحفظ کی خاطر جان دینی پڑ جائے تو وہ بلا تامل جان بھی دے دیتا ہے۔ قرآن کریم نے اسے دعوائے ایمان کی صداقت کا (TEST) قرار دیا ہے۔ یہود کا دعویٰ تھا کہ وہ اللہ کے پیارے۔ اولیاء اللہ ہیں۔ ان سے کہا گیا کہ اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّکُمْ اَوْلِیَآءُ لِلّٰہِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (۶۲/۶) اگر تم سمجھتے ہو کہ اور لوگ نہیں، صرف تم ہی اللہ کے دوست ہو تو اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو تو موت کی آرزو کر کے دکھاؤ۔ واضح رہے کہ موت کی "تمنا" سے مراد وہ نفس کشی نہیں جو ہمارے ہاں "اولیاء اللہ" کی نشانی بتائی جاتی ہے ـــــ نفس کشی کا تو تصور ہی غیر قرآنی ہے اور عیسائی رہبانیت، ہندوؤں کے یوگ، اور بدھوں کے نروان سے لیا گیا ہے ـــــ قرآن کی رو سے موت کی تمنا سے مراد ہے۔ قتال فی سبیل اللہ۔ خدا کی راہ میں جنگ کرنا اور اس طرح دین کی محافظت کے لئے کفن بدوش اور سربکف دشمن کے مقابلہ کے لئے میدان میں نکل آنا۔ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَ یُقْتَلُوْنَ ـــــ (۹/۱۱۱) وہ خدا کی راہ میں جنگ کرتے ہیں پھر یا تو فاتح و منصور واپس آتے ہیں یا میدان جنگ میں جان دے دیتے ہیں۔ خانقاہوں میں بیٹھے اپنے نفس کے خلاف "جہاد اکبر" میں مصروف رہنا قرآن کی رو سے "قتال فی سبیل اللہ" نہیں۔

حزب اللہ

یہی وہ جماعت مومنین ہے جسے قرآن نے "حزب اللہ" کہہ کر پکارا ہے۔ اُولٰٓئِکَ حِزْبُ اللّٰہِ ۔ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ـــــ (۵۸/۲۲) ان کے برعکس غیر مسلموں کو اس سے

"حزب الشیطان" کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے (۵۸/۱۹)۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے، پوری کی پوری جماعت مومنین کا نام "اولیاء اللہ" ہے۔ یہ ان کی خصوصیت ہے۔ اس جماعت کے اندر اولیاء اللہ کا کوئی الگ گروہ نہیں لیکن ہمارے ہاں اولیاء اللہ کا ایک الگ گروہ تصور کیا جاتا ہے۔ اور ان کی خصوصیات بھی عام جماعت مومنین سے جداگانہ سمجھی جاتی ہیں۔ ان کے متعلق عام عقیدہ یہ ہے کہ وہ نفع یا نقصان پہنچانے کی قدرت رکھتے ہیں۔ اس لئے لوگ اپنی مرادیں مانگنے کے لئے ان کی طرف رجوع کرتے اور ان کی نامگی سے ڈرتے ہیں۔ قرآن کریم کی رو سے یہ عقیدہ توہم پرستی کا پیدا کردہ، فلہذا انتہائی کمزور اور بودا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا وَ اِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ـــــ (۲۹/۴۱)

نفع نقصان کی قدرت نہیں

وہ لوگ جو اللہ کے سوا اوروں کو اولیاء تصور اور تسلیم کرتے ہیں ان کی مثال مکڑی کی سی ہے۔ وہ ایک گھر بناتی ہے۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ اس کا گھر کس قدر کمزور اور بودا ہوتا ہے۔ اے کاش! لوگ علم و بصیرت سے کام لے کر سوچتے کہ ان کے اس قسم کے عقائد کس قدر جہالت پر مبنی ہوتے ہیں۔ جہاں تک کسی کو نفع یا نقصان پہنچانے کا تعلق ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ تو اپنی ذات کے لئے بھی نفع نقصان کا اختیار نہیں رکھتے۔ چہ جائیکہ دوسروں کو نفع یا نقصان پہنچا سکیں۔ یہ سب کچھ قانونِ خداوندی کے مطابق ہوتا ہے۔ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا۔ (۱۳/۱۶) ان سے کہو کہ کیا تم اللہ کے سوا اوروں کو اولیاء تسلیم کرتے ہو۔ جن کی حالت یہ ہے کہ وہ خود اپنے آپ کے لئے بھی کسی نفع یا نقصان کا اقتدار نہیں رکھتے۔ عام اولیاء اللہ تو ایک طرف اس باب میں اس ذاتِ اقدس و اعظم کے متعلق جن کا مقام یہ ہے کہ ـــــ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر ـــــ خدا کا ارشاد ہے کہ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ـــ (۷/۱۸۸) ان سے کہو کہ میں اپنی ذات کے لئے بھی کسی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتا۔ یہ سب خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہم ان "اولیاء اللہ" کی طرف اس لئے رجوع کرتے ہیں کہ چونکہ یہ خود مقربینِ بارگاہِ خداوندی ہیں

یہ خدا کا مقرب بنا دیں گے

اس لئے یہ ہمیں بھی خدا کا مقرب بنا دیں گے۔ ہم ان کی اطاعت، قربِ خداوندی حاصل کرنے کے لئے کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے اس عقیدہ کا بھی ذکر کیا ہے اور اس کی سختی سے تردید کی ہے۔ سورۃ الزمر میں ہے۔ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ـ ہم نے تیری طرف یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی ہے۔ سو تم اس کتاب کے مطابق، خدا کی اطاعت

اور محکومیت اختیار کرو۔ اور اس اطاعت کو اس کے لئے مختص کردو۔ اس میں کسی اور کو شریک مت کرو۔ اَلَا لِلّٰہِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ۔ پھر سن رکھو کہ اطاعت خالصۃً احکام و قوانین خداوندی کی ہوگی جو اس نے اس کتاب میں دے رکھے ہیں۔ وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِیَآءَ ۔ مَا نَعْبُدُھُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰہِ زُلْفٰى ۔ جو لوگ اس کے سوا اوروں کو اولیاء تسلیم کر لیتے ہیں۔ (وہ کہتے ہیں کہ) ہم ان کی اطاعت اس لئے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں خدا کا مقرب بنا دیں گے۔ اِنَّ اللّٰہَ یَحْکُمُ بَیْنَھُمْ فِیْ مَا ھُمْ فِیْہِ یَخْتَلِفُوْنَ ۔ اللہ ان کی ان باتوں کا ابھی فیصلہ کرتا ہے جن میں یہ (دین کی اصل و حقیقت سے) اختلاف کرتے ہیں۔ اور وہ فیصلہ یہ ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِیْ مَنْ ھُوَ کٰذِبٌ کَفَّارٌ (۳۹/۳) جو جھوٹا اور ناشکر گذار ہے، خدا اسے کبھی منزل مقصود تک نہیں پہنچاتا۔ یاد رکھو! مَنْ یَّھْدِ اللّٰہُ فَھُوَ الْمُھْتَدِ ۔ صحیح راستے پر وہی ہے جو خدا کے بتائے ہوئے راستے پر چلتا ہے۔ وَمَنْ یُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَہٗ وَلِیًّا مُّرْشِدًا (۱۸/۱۷) اور جو اس کی راہ نمائی کو چھوڑ کر، اور راہیں اختیار کر لے، تو اس کا کوئی ولی ہو سکتا ہے نہ مرشد۔ مرشد (صحیح راستہ دکھانے والا) اور ولی (جس کی اطاعت کی جائے) صرف خدا کی ذات ہے؛ اور اس کی اطاعت اس کتاب کے ذریعے کی جاتی ہے۔ جسے اس نے انسانوں کی راہ نمائی کے لئے نازل کیا ہے۔

اس ضمن میں یہ کہا جاتا ہے کہ اولیاء اللہ "خدا تک پہنچنے (یا اپنی دعاؤں کو خدا تک پہنچانے) کا وسیلہ (ذریعہ) ہیں۔ اور ہم اسی مقصد کے لئے ان کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس عقیدہ کی تائید میں سورۃ مائدہ کی یہ آیت پیش کی جاتی ہے

یہ وسیلہ ہیں!

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَابْتَغُوْٓا اِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَ وَجَاھِدُوْا فِیْ سَبِیْلِہٖ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ (۵/۳۵) اس کا سیدھا سادہ ترجمہ یہ ہے۔ "اے ایمان والو! تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ اور اس کی طرف "وسیلہ" طلب کرو۔ اور اس کی راہ میں جہاد کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ"۔ اس لفظ "وسیلہ" سے پیر پرستی کی دلیل لائی جاتی ہے۔ اور پھر اس پر شخصیت پرستی کی وہ عظیم عمارت قائم کر دی جاتی ہے جسے مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا۔ اور جو نبی اکرمؐ کی بعثت کا مقصد تھا — وَیَضَعُ عَنْھُمْ اِصْرَھُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْھِمْ (۷/۱۵۷) — قرآنی آیات کا اسی قسم کا غیر قرآنی مفہوم ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے کہا ہے یُضِلُّ بِہٖ کَثِیْرًا وَّ یَھْدِیْ بِہٖ کَثِیْرًا ۔ (۲/۲۶) بہت سے لوگ اس قرآن (کا غلط مفہوم لے کر) گمراہ ہو جاتے ہیں اور بہت سے اس سے صحیح راہ نمائی حاصل کر لیتے ہیں۔

عربی زبان میں لفظ "وسیلہ" کے معنی ذریعہ ہی نہیں بلکہ مرتبہ، درجہ، قرب، منصب، منزلت بھی ہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو اور خدا کے ہاں درجہ، مرتبہ، قرب، منزلت طلب کرو۔ اس کا طریق یہ ہے کہ تم اس کے راستے میں پوری پوری جدوجہد کرتے رہو۔ اس سے تم مقصد زندگی کے حصول میں کامیاب ہو جاؤ گے۔

یہ مفہوم کہ تقویٰ سے خدا کے ہاں درجہ اور منزلت حاصل ہو جاتی ہے۔ قرآن کے متعدد مقامات سے واضح ہے کہ مثلاً اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ؕ ـــــ (۴۹/۱۳) خدا کے ہاں تم میں سے زیادہ واجب العزت وہ ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ شعار ہے۔ اور اگر "وسیلہ" کے معنی "ذریعہ" کئے جائیں تو بھی مطلب واضح ہے کہ تم تقویٰ اور جہاد کے ذریعہ خدا کے ہاں قدر و منزلت طلب کرو۔ قرآن، خدا اور انسان کا براہ راست تعلق قائم کرتا ہے اور یہ تعلق اس کی

خدا اور انسان کا براہ راست تعلق

کتاب کے ذریعہ قائم ہوتا ہے۔ خدا اور انسان کے درمیان دوسرے انسانوں کے ذریعہ بننے کا تصور غیر قرآنی ہے۔ اسی لئے اس کے واضح الفاظ ہیں کہ وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ۔ جب (اے رسول) تجھ سے میرے بندے میرے متعلق دریافت کریں تو ان سے کہہ دو کہ میں ان سے قریب ہوں۔ اتنا قریب کہ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔ میں ہر اس شخص کی پکار کا جو مجھے پکارتا ہے جواب دیتا ہوں لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّھُمْ یَرْشُدُوْنَ (۲/۱۸۶) انہیں چاہیئے کہ میری قوانین کی پیروی کریں۔ مجھ پر ایمان رکھیں۔ تاکہ انہیں رشد و ہدایت مل جائے۔ بات کس قدر صاف ہے۔ جو شخص قوانین خداوندی کی صداقت پر ایمان رکھتا ہے۔ اور ان کی اطاعت کرتا ہے۔ اسے وہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے جس کے لئے لوگ "مرشد" تلاش کرتے رہتے ہیں۔ قرآن کی تعلیم کا نقطہ ماسکہ یہ سمجھئے کہ وہ خدا اور بندے کے درمیان کسی طاقت کو حائل نہیں ہونے دیتا ـــــ نہ سیاست میں حکمران کی طاقت کو۔ نہ رزق کے معاملہ میں سرمایہ دار کی طاقت کو۔ نہ مذہب میں پیشوائیت کی طاقت کو۔ (اسلام میں مذہب اور سیاست الگ الگ عناصر ہیں ہی نہیں) اور نہ "خدا اور بندے کے تعلق" کے لئے پیرانِ طریقت کی طاقت کو۔ اس کی کتاب کے ذریعہ ہر شخص کا خدا سے براہ راست تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ اور اس کی اطاعت اس نظام کے ذریعہ ہوتی ہے جو اس مقصد کے لئے باہمی مشاورت سے متشکل کیا جاتا ہے۔

"اولیاء اللہ" کے غلط تصور کی رو سے خدا اور انسانوں کے درمیان ان کے "خاص بندوں" کی کڑی کو کس قدر لاینفک سمجھا جاتا ہے اس کا اندازہ اس حکایت سے لگائیے جو خانقاہیت کی تعلیم گاہوں میں سب سے پہلے ذہن نشین کرائی جاتی ہے۔

یا فرید یا فرید

حکایت یہ ہے کہ حضرت بابا فریدؒ دریا کے اس پار رہتے تھے اور ان کی خانقاہ دریا کے اس پار تھی۔ وہ ہر صبح گھر سے نکلتے۔ آگے آگے آپ۔ پیچھے پیچھے آپ کا ایک مقرب مرید۔ دریا کے کنارے پہنچتے تو کسی پُل یا کشتی کے بغیر پانی پر سیدھے چلتے ہوئے اُس پار پہنچ جاتے اسی طرح شام کو واپس آجاتے۔ مرید سے انہوں نے کہہ رکھا تھا کہ پانی پر چلتے وقت یا فریدؒ یا فریدؒ پکارتے رہا کرو۔ اس طرح برسوں گزر گئے۔ ایک دن، پانی پر چلتے مرید نے سنا کہ خود باباؒ صاحب بھی کچھ الفاظ دہرا رہے ہیں۔ اس نے کان لگا کر سنا تو وہ کہہ رہے تھے ... ـــــ یا اللہ۔ مرید نے دل میں سوچا کہ میں بھی "یا فریدؒ" کے بجائے "یا اللہ" ہی کیوں نہ کہوں۔ اس نے جوں ہی "یا اللہ" کہا دھڑام سے پانی

میں گر گیا۔ اور لگا غوطے کھانے۔ بابا صاحب نے اسے سنبھالا۔ اور کنارے پر آکر پوچھا کہ آج کیا ہوا تھا! اس نے ڈر کے کانپتے بات بتائی۔ تو آپ نے فرمایا کہ تم نے کبھی اللہ کو دیکھا ہے؟ اس سے براہ راست کوئی راہ و رسم ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ جس سے تمہاری نہ جان نہ پہچان۔ اُسے تم اپنی مدد کے لئے کس طرح پکار سکتے ہو؟ فریدؒ کی خدا سے راہ و رسم ہے اس لئے وہ اسے پکارتا ہے۔ تمہاری فرید سے راہ و رسم ہے تم اسے پکارو۔ جس دن تمہاری راہ و رسم خدا سے براہ راست ہو جائے گی تم نے بھی اسے پکار لینا!

یہ اور اس قسم کی حکایات سے شروع ہی سے یہ چیز ذہن نشین کرائی جاتی ہے کہ خدا کے مقرب بندے۔ اولیاء اللہ۔ خدا اور دوسرے انسانوں کے درمیان لائینگ کڑی ہوتے ہیں۔ تم خدا سے براہ راست اپنا رشتہ جوڑ ہی نہیں سکتے۔ اور ان سے یہ رشتہ ان کی زندگی تک ہی محدود نہیں سمجھا جاتا ہے۔ ان کی وفات کے بعد بھی ان سے بدستور قائم رہتا ہے اس لئے کہ اولیاء اللہ کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ وہ مرنے کے بعد بھی اسی طرح حاضر و ناظر رہتے ہیں جس طرح زندگی میں۔ وہ سب

مُردے ہماری سُن نہیں سکتے

کی سنتے ہیں۔ سب کچھ دیکھتے ہیں۔ مانگنے والوں کی مرادیں پوری کرتے ہیں۔ خدا کے ہاں ان کی سفارش کرتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کریم واضح الفاظ میں کہتا ہے۔ وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنْ يَدْعُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ مَنْ لَا يَسْتَجِيبُ لَهُ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَائِهِمْ غَافِلُونَ۔ اور اس سے بڑھ کر گمراہ اور کون ہے جو اللہ کو چھوڑ کر اسے پکارتا ہے جو قیامت تک اس کی پکار کا جواب نہیں دے سکتا۔ (جواب دینا تو ایک طرف) وہ ان کی پکار سے یکسر بے خبر ہوتے ہیں۔ انہیں اس کا بھی علم نہیں ہوتا کہ انہیں کون پکار رہا ہے۔ وَإِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوا لَهُمْ أَعْدَاءً وَكَانُوا بِعِبَادَتِهِمْ كَافِرِينَ (۴۶/۵-۶) اور جب لوگوں کو اکٹھا کیا جائے گا تو یہ (اپنے ان پکارنے والوں کے) دشمن ہوں گے اور ان کی پرستش سے یکسر انکار کر دیں گے۔ یہ آیت واضح طور پر بتا رہی ہے کہ یہاں کفار کے بتوں یا ان کے دیگر معبودانِ باطل کا ذکر نہیں۔ ذکر خدا کے ان نیک بندوں کا ہے جنہیں لوگ ان کی وفات کے بعد اپنی مرادوں کے لئے پکارتے ہیں۔ ان کا ان عقیدت مندوں کی اس قسم کی حرکات سے بری الذمہ ہونے کا اظہار ان کے خدا کے مخلص بندے ہونے کی شہادت ہے۔ ان کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ وہ اپنے پکارنے والوں کی پکار کو سن ہی نہیں سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی رو سے مرنے والوں کا اس دنیا سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔ ان کا تعلق اُس دنیا سے پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے کہا ہے کہ إِنْ تَدْعُوهُمْ لَا يَسْمَعُوا دُعَاءَكُمْ۔ اگر تم انہیں پکارو تو وہ تمہاری پکار کو سنتے ہی نہیں۔ وَلَوْ سَمِعُوا مَا اسْتَجَابُوا لَكُمْ اور اگر بفرض محال وہ تمہاری پکار کو سن بھی لیتے تو وہ اس کا جواب نہیں دے سکتے تھے۔ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُونَ بِشِرْكِكُمْ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيرٍ (۳۵/۱۴) اور قیامت کے دن وہ تمہارے اس شرک سے اظہارِ نفرت

اور بیزاری کریں گے۔ یہ باتیں تمہیں وہ خدا بتا رہا ہے جس سے کچھ بھی چھپا نہیں۔ وہ اس دنیا سے چلے جانے والوں کے احوال و کوائف سے اچھی طرح واقف ہے۔ یہاں بھی آیت کے دوسرے حصے سے واضح ہے کہ بات خدا کے ان نیک بندوں کی ہو رہی ہے جو اپنے ان عقیدت مندوں کے اس شرک سے متنفر ہوں گے۔ جو چونکہ جنہیں یہ لوگ پکارتے ہیں وہ ان کے اس فعل کو شرک قرار دیتے ہیں۔ اور یہ ان کے عقیدت مند اور تابع فرمان بنتے ہیں۔ ان کے متعلق ان کا عقیدہ ہے کہ وہ

غیب کا علم کوئی نہیں جانتا

غیب کی باتیں جانتے ہیں اور خدا کا ارشاد ہے کہ قُل لَّا يَعْلَمُ مَن فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللّٰهُ۔ ان سے کہدو کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں خدا کے سوا کوئی نہیں جو غیب کا علم رکھتا ہو۔ اور مُردوں کی تو حالت یہ ہے کہ وَمَا يَشْعُرُونَ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ (۲۷/۶۵) انہیں اس کا بھی علم نہیں کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے[۱]۔ کہہ دیتے ہیں کہ یہ آیات عام مُردوں سے متعلق ہیں ـ شہیدوں سے متعلق نہیں۔ شہید زندہ ہوتے ہیں۔ اس کے بعد ان اولیاء اللہ کو شہیدوں کے زمرے میں شامل کر دیتے ہیں کیونکہ انھوں نے اپنے نفس کو مار دیا ہوتا ہے۔ بلکہ ان کا رتبہ شہداء سے بھی بڑھ کر بتایا جاتا ہے۔ جب کہا جاتا ہے کہ

او کشتۂ دشمن است، ایں کشتۂ دوست

شہداء کے متعلق

اس باب میں سب سے پہلے ضمناً اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ مقتولین فی سبیل اللہ کے لئے شہداء کی اصطلاح قرآن میں نہیں آئی۔ قرآن کی رو سے پوری کی پوری امتِ محمدیہ شہداء علی الناس ہے۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا (۲/۱۴۳)۔ اس طرح ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی امت بنایا ہے تاکہ تم تمام نوعِ انسان کے اعمال کی نگرانی کر سکو اور رسول (اور اس کے بعد اس کا جانشین) تمہارے اعمال کی نگرانی کرے۔

(۲) قرآن کریم میں "مقتولین فی سبیل اللہ" کے متعلق ہے۔

---

[۱] علم غیب کے متعلق اور تو اور خود رسول اللہ سے ارشاد ہے قُل لَّا أَقُولُ لَكُمْ عِندِي خَزَائِنُ اللّٰهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ (۶/۵۰)۔ ان سے کہہ دو کہ میں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں نہ ہی یہ کہتا ہوں کہ میں غیب کا علم جانتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو (اور دیگر رسولوں کو) جن امورِ غیب کا علم دینا چاہتا تھا وہ وحی کے ذریعے دے دیتا تھا۔ جیسا کہ قرآن کریم میں حضرت مریمؑ کا قصہ بیان کرنے کے بعد فرمایا۔ ذٰلِكَ مِنْ أَنبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ (۳/۴۴) یہ غیب کی ان خبروں میں سے ہے جسے اللہ نے تیری طرف وحی کیا ہے۔ چونکہ وحی نبی اکرمؐ کے ساتھ ختم ہو گئی اس لئے اس کے بعد کسی کو غیب کا علم ہونے کا امکان بھی ختم ہو گیا۔ جو غیب کے علم کا دعویٰ کرتا ہے وہ درحقیقت نبوت کا دعویٰ کرتا ہے۔

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ ـ (۲/۱۵۴)

جو اللہ کی راہ میں قتل ہو جاتے ہیں۔ انہیں مردہ مت کہو۔ وہ زندہ ہیں۔ لیکن تم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر ان کی زندگی کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔

دوسری جگہ ہے۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ عِندَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ ـــــــــــ (۳/۱۶۸)

جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کر دیئے جائیں۔ انہیں مردہ مت خیال کرو۔ وہ اپنے اللہ کے ہاں زندہ ہیں اور رزق پاتے ہیں۔

مقتولین فی سبیل اللہ کی یہ زندگی کس قسم کی ہے اس کے متعلق بعد میں ذکر کیا جائے گا۔ اس ضمن میں پہلے دو ایک باتوں کا سمجھ لینا ضروری ہے۔

(۱) مقتولین فی سبیل اللہ کے جو خصوصی مراتب ہیں وہ انہی تک محدود نہیں۔ جو میدان جنگ میں جان دے دیں۔ وہ اُن سب کے لئے ہیں ...... جو اللہ کی راہ میں جان دینے کے لئے تیار رہیں۔ مثلاً رسول اللہؐ اور حضورؐ کے صحابہؓ ان تمام لڑائیوں میں شریک ہوئے جو فی سبیل اللہ لڑی گئیں۔ ان میں سے بعض صحابہؓ میدانِ جنگ میں مقتول ہو گئے۔ خود حضورؐ اور بہت سے صحابہؓ اس طرح مقتول نہ ہوئے بلکہ زندہ رہے۔ اگر ان خصوصی مراتب کو مقتولین تک محدود سمجھ لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ دیگر مجاہدین (جو میدانِ جنگ میں مقتول نہیں ہوئے اور خود رسول اللہؐ) ان مراتب سے محروم رہ گئے۔؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ محض اتفاقی امر تھا کہ ان مجاہدین میں سے بعض میدانِ جنگ میں مقتول ہو گئے۔ اور باقی زندہ واپس آ گئے۔ قرآن کریم نے اس کی تصریح کر دی ہے کہ ان مراتب میں یہ سب شریک ہیں۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے۔ وَلَئِن قُتِلْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ (۳/۱۵۷) اور اگر تم اللہ کی راہ میں قتل کئے جاؤ یا مر جاؤ تو تم اللہ کی مغفرت اور رحمت کے مستحق ہو گے اور یہ متاعِ عظیم ہر اس چیز سے بہتر ہے جسے لوگ جمع کرتے ہیں۔" اس سے واضح ہے کہ خدا کی راہ میں جان دے دینے کا تہیہ کرنے والے خواہ مقتول ہوں یا ویسے ہی فوت ہو جائیں۔ ان کے مراتب یکساں ہوں گے۔ دوسری جگہ ہے۔ وَمَن يُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيُقْتَلْ أَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا (۴/۷۴) جو اللہ کی راہ میں جنگ کرے، تو اس کے بعد وہ قتل ہو جائے یا دشمن پر غالب آ جائے تو ہم اسے بہت بڑا اجر دیں گے۔ اسی حقیقت کو سورۂ توبہ میں ان الفاظ

میں دہرایا گیا ہے۔ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ (۹/۱۱۱) وہ (مومنین) اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں۔ وہ دشمنوں کو قتل کرتے ہیں اور قتل ہو بھی جاتے ہیں۔

(ب) یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ مقتولین فی سبیل اللہ پر طبعی موت (PHYSICAL DEATH) وارد ہی نہیں ہوتی۔ طبعی موت، ہر ذی حیات کے لئے ہے۔ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ۔ (۳/۱۸۴) ہر ذی حیات کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ یہ خدا کا اٹل قانون ہے۔ حتیٰ کہ خود نبی اکرمؐ کے متعلق ارشاد ہے کہ۔ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ۔ (۳۹/۳۰) تو بھی مرنے والا ہے اور یہ لوگ بھی مرنے والے ہیں۔

(ج) یہ بھی صحیح نہیں کہ موت کے بعد زندگی صرف مقتولین فی سبیل اللہ کے لئے ہے۔ اوروں کے لئے نہیں۔ موت کے بعد زندگی ہر ایک کے لئے ہے۔ یہ حقیقت ہمارے ایمان کا جزو ہے۔ مومن اور کافر ہر ایک کو مرنے کے بعد زندہ ہونا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے۔ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ (۲/۲۸) تم خدا کا کس طرح انکار کر سکتے ہو۔ تم مردہ تھے اس نے تمہیں زندگی عطا کی۔ پھر وہ تم پر موت طاری کرے گا اور پھر تم زندہ ہو گے۔

مقتولین فی سبیل اللہ کے زندہ ہونے کا خصوصیت سے ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ منافقین کا اعتراض یہ تھا کہ اگر یہ لوگ جنگ میں نہ جاتے تو موت سے بچ جاتے۔ اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا۔ ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ یہ خود میدانِ جنگ میں نہیں گئے۔ گھروں میں بیٹھے رہے اور ان کے بھائی بند (مجاہدین) جو میدان میں گئے ان کے متعلق کہتے ہیں کہ اگر وہ ہمارا کہنا مانتے (اور جنگ میں نہ جاتے) تو قتل نہ ہوتے۔" اس کے جواب میں ان سے کہا گیا کہ اول تو یہ بتاؤ کہ کیا تم ہمیشہ زندہ رہو گے؟ ۔ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۔ (۳/۱۶۷) اگر تم اس بات میں سچے ہو تو اپنے آپ سے موت کو ہٹا کر بتاؤ۔" اور دوسرے یہ کہ جو لوگ حق و صداقت کی راہ میں جان دیتے ہیں انہیں مردہ مت سمجھو۔ مردہ تو تم ہو جو ذلت کی زندگی جی رہے ہو۔ حیات، مرگِ با شرف کا نام ہے اور مرگ، حیاتِ بے شرف کا نام۔ زندہ ہونے کو تو، مرنے کے بعد مومن و کافر دونوں زندہ ہوتے ہیں لیکن ایک زندگی اہلِ جہنم کی ہے جس کے متعلق فرمایا کہ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ۔۔۔۔ (۲۰/۷۴) "وہ اس میں نہ مرے گا نہ جئے گا۔ اور ایک زندگی اہلِ جنت کی ہے۔ جس میں کیفیت یہ ہوگی۔ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ۔ (۳/۱۷۰) جو نعمائے انہیں خدا کے فضل سے ملتی ہیں وہ ان سے بہت خوش ہوتے ہیں۔

بہر حال یہ واضح ہے کہ مقتولین فی سبیل اللہ کی وہ زندگی یہاں کی طبعی زندگی جیسی نہیں۔ اس لئے کہ ان کی

طبعی زندگی کے متعلق ہم سب کچھ سمجھتے ہیں لیکن ان کی اس دنیا کی زندگی کے متعلق فرمایا وَلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ (۲/۱۵۴) اس کی کنہ وحقیقت تمہارے عقل وشعور میں نہیں آسکتی۔ دوسرے یہ کہ ان کا اس دنیا والوں سے کچھ تعلق نہیں رہتا۔ جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کوئی کتنا ہی مقرب بارگاہ خداوندی کیوں نہ ہو وہ اس دنیا سے چلے جانے کے بعد نہ ہماری پکار کو سن سکتا ہے۔ نہ اس کا جواب دے سکتا ہے۔ اس میں مقتولین فی سبیل اللہ کی بھی کوئی استثناء نہیں۔ (قرآن نے ایسی استثناء نہیں کی) اگر ان کی زندگی اور دوسرے مرنے والوں کی زندگی میں کوئی فرق ہے تو وہ فرق خدا کے ہاں ہے اس لئے فرمایا کہ بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ۔ (۳/۱۶۸) وہ اپنے رب کے حضور زندہ ہیں وہیں سے انھیں سامان نشوونما ملتا ہے۔ وہ اس احساس سے خوش ہوتے ہیں کہ ان کی اس عظیم قربانی سے پیچھے رہ جانے والے مومنین کے لئے ایسا معاشرہ قائم ہوگیا جس میں انہیں کوئی خوف اور حزن نہیں۔ (۳/۱۶۹) اس سے زیادہ ان کا ہمارے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

اولیاء اللہ کی کرامات

اب رہا یہ آخری سوال کہ "اولیاء اللہ رح سے کرامات سرزد ہوتی ہیں تو سب سے پہلے یہ بات سمجھ لینی چاہیئے کہ جس قسم کی کرامات ہم اپنے ہاں کے اولیاء اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں، غیر مسلم اسی قسم کی (بلکہ بعض صورتوں میں ان سے بھی زیادہ محیرالعقول) کرامات اپنے ہاں کے بزرگوں کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اور جس طرح ہمارے ہاں لوگ کہتے ہیں کہ انہوں نے ان کرامات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اسی طرح ان کے ہاں لوگ بھی اس کی شہادت دیتے ہیں۔ اس لئے کسی سے کسی محیرالعقول بات کا سرزد ہونا اس کے مقرب بارگاہ خداوندی ہونے کی دلیل نہیں ہوسکتا۔ انسان کے اندر بہت سی ایسی طبعی قوتیں مضمر ہیں جن کی اگر مناسب طریق سے نشوونما (DEVELOPMENT) کرلی جائے تو اس سے ایسی باتیں سرزد ہوسکتی ہیں، جو دوسروں کے نزدیک محیرالعقول ہوں۔ امریکہ کے ہسپتالوں میں اب روزمرہ ایسے آپریشن کئے جاتے ہیں (بالخصوص بچوں کے) جن میں مریض کو بے ہوش نہیں کیا جاتا۔ لیکن انہیں درد کا احساس مطلقاً نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر اپنی قوتِ خیال (ہپناٹزم) سے مریض پر ایسا اثر انداز ہوتا ہے کہ اسے درد کا احساس ہی نہیں ہونے پاتا۔ اس کی اب وہاں باقاعدہ ٹریننگ دی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں اگر کوئی شخص دوسرے کی طرف دیکھ کر یا ایک پھونک مار کر اس کا دردِ سر دور کر دے تو اس کی پرستش ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ لیکن وہاں نہ ان ڈاکٹروں کی کوئی پرستش کرتا ہے نہ خود انہیں کسی "روحانیت" کا دعویٰ ہوتا ہے۔ وہاں یہ چیز سائینس بن چکی ہے لیکن یہاں ابھی تک "باطنی علم" کا راز ہے۔

معجزہ صرف قرآن ہے

یاد رکھیئے! اسلام میں معجزہ صرف خدا کی کتاب ہے۔ جب مخالفین نبی اکرمؐ سے معجزات طلب کرتے تو ان کی توجہ بھی اس معجزہ کی طرف مبذول کرائی جاتی تھی۔ سورہ عنکبوت میں ہے۔ وَقَالُوْا لَوْلَآ

اَنْزِلَ عَلَيْهِ آيَاتٌ مِّن رَّبِّهِ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس رسول پر اس کے رب کی طرف سے (محسوس) نشانات (معجزات) کیوں نہیں اتارے گئے۔ قُلْ إِنَّمَا الْآيَاتُ عِندَ اللَّهِ — ان سے کہو کہ معجزات خدا کے ہاں ہیں۔ یہ ساری کائنات اس کی خلاقیت کا معجزہ ہے۔ یہاں کا ذرہ ذرہ معجزہ ہے۔ سارے انسان مل کر بھی چاہیں تو گھاس کی ایک پتی پیدا نہیں کر سکتے۔ باقی رہا میں تو إِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ"۔ میرا منصب صرف یہ ہے کہ میں تمہیں زندگی کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کروں۔ یہ چیز میں اس کتاب کے ذریعے سے کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی گئی ہے۔ یہ کتاب سب سے بڑا معجزہ ہے۔ أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ کیا ان کے لئے یہ کافی نہیں کہ ہم نے تجھ پر یہ کتاب نازل کی ہے جو ان کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَرَحْمَةً وَذِكْرَىٰ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ — (۲۹/۵۱) اس کتاب میں ان لوگوں کے لئے جو اس کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں، خدا کی رحمت اور (انسانی مقصد زندگی کی) یاد دہانی ہے۔ خدا کی یہ کتاب ایک زندۂ جاوید معجزہ ہے یہ آج بھی اسی طرح معجزہ ہے جس طرح نبی اکرمؐ کے زمانہ میں معجزہ تھی۔ اس پر عمل پیرا ہونے سے ایسے نتائج مرتب ہوتے ہیں جو اقوامِ عالم کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیں۔ اس میں جو نظامِ حیات پیش کیا گیا ہے ساری دنیا کے انسان مل کر بھی اس جیسا نظام مرتب نہیں کر سکتے۔ جب تک یہ امت اس قرآن پر عمل پیرا رہی، اس سے قدم قدم پر معجزات سرزد ہوتے رہے۔ جب اس کے ہاتھ سے اس کا دامن چھوٹ گیا، یہ کرامات کی تلاش میں ماری ماری پھرنے لگی۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا
ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات

قرآن نے مومنین کی جماعت (اُمتِ مسلمہ) پیدا کی تھی جس میں اولیاء اللہ کا الگ گروہ کوئی نہیں تھا۔ اس جماعت کا ہر فرد ولی اللہ تھا۔ ان اولیاء اللہ کی جماعت کا منصب دنیا میں نظامِ خداوندی کا قیام تھا۔ اسے انہوں نے عملاً متشکل کر کے دکھایا۔ اور اس کے نتائج سے اس نظام کے بے مثل اور بے نظیر ہونے کی شہادت بہم پہنچا دی۔ یہی ان کی کرامت تھی۔ جب

تصوّف

وہ نظام باقی نہ رہا تو مختلف تصورات مختلف گوشوں سے اسلام میں داخل ہونے شروع ہو گئے۔ ان میں ایک اہم تصور تصوف کا تھا جو علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں "اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا ہے"۔ [1] اولیاء اللہ کا وہ تصور جو آج کل ہمارے ہاں مروج ہے، اسی تصوف کا پیدا کردہ ہے۔ عیسائی خانقاہوں میں (SAINTS) تھے۔ انہی کا مثنیٰ ہم نے اپنے ہاں بنایا۔ اور انہیں اولیاء اللہ کہنے لگ گئے۔ ان اولیاء اللہ کی خصوصیات وہ نہیں جو قرآن نے جماعتِ مومنین کی بتائی ہیں۔ ان کی خصوصیات عیسائی خانقاہوں کے (SAINTS)

---

[1] تصوف کے متعلق تفصیلی مباحث "سلیم کے نام خطوط" میں ملیں گے۔

کی سی ہیں — وہی ترکِ دنیا و ترکِ لذات کا بنیادی عقیدہ۔ مادی کائنات سے نفرت۔ اور زندگی کا منتہیٰ "روحانیت"۔ وہی رسوم و مناسکِ خانقاہیت۔ چلّے۔ ریاضتیں۔ فاقہ کشیاں۔ وہی کشف و الہام کا عقیدہ — جس کی اسلام میں ختمِ نبوت کے بعد کہیں گنجائش نہ تھی۔ وہی ان کی کرامات۔ وہی مرنے کے بعد ان کی قبروں کا مرجعِ انام بننا اور ان سے مرادیں مانگنا۔ غرضیکہ وہاں کی ایک ایک چیز ہمارے ہاں آئی اور رفتہ رفتہ عین اسلام بلکہ مغزِ دین بن گئی۔ اسلام ایسی امت پیدا کرنے کے لئے آیا تھا جو دنیا میں نظامِ عدل و احسان قائم کرے۔ جو دیکھے کہ دنیا میں کہیں کسی پر ظلم اور زیادتی نہیں ہو رہی۔ جہاں ظلم ہو رہا ہو وہ ظالم کی کلائی مروڑ کر اسے انصاف کی بارگاہ کے سامنے جھکا دے۔

خانقاہیت کا ضابطہ اخلاق

لیکن اس تصورِ خانقاہیت نے ایک نیا ضابطۂ اخلاق (CODE OF ETHICS) دیا جس میں قوت کا استعمال حرام اور عدل کا تصور گناہ قرار پا گیا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ قوم پر چاروں طرف سے بیکسی و بے لبسی۔ ناتوانی و بیچارگی۔ افسردگی و پژمردگی کے بادل چھا گئے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

مسکینی و محکومی و نومیدیٔ جاوید — جس کا یہ تصوف ہو وہ اسلام کر ایجاد

یہ وہ اسلام نہیں جسے خدا نے اپنے بندوں کے لئے بطور نظامِ حیات (دین) تجویز کیا تھا اور جسے محمد رسول اللہ و الذین معہٗ کے مقدس ہاتھوں نے عملاً متشکل کر کے دکھا دیا تھا۔ اس اسلام میں پوری کی پوری جماعتِ مومنین، خدا کی سپاہ اور اولیاء اللہ تھی۔ اور وہ وسیع و عریض مملکت جس میں خدا کے قوانین عملاً نافذ تھے، ان کی کرامت تھی۔ اس میں اولیاء اللہ قبروں کے سرہانے بیٹھے دکھائی نہیں دیتے تھے۔ جنگ کے میدانوں میں کفن بردوش اور شمشیر بکف نظر آتے ہیں۔ یا تمدن و معاشرت کی بساط پر انسانیت کے الجھے ہوئے مسائل سلجھانے میں منہمک۔

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل! — یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات

وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست — یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات

اُس میں تمام مومنینؓ اولیاء اللہ تھے اور یہی اولیاء اللہ کا قرآنی مفہوم ہے یعنی كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ (۳/۱۱۰) بہترین امت جسے نوعِ انسانی کی بھلائی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ معروف کا حکم دینے والی اور منکر سے روکنے والی۔

اسبابِ افتراقِ اُمّت

از علامہ السید احمد السیفی

(ترجمہ و تلخیص سید نصیر شاہ صاحب میانوالی)

(مصر سے ایک کتاب شائع ہوئی ہے "عقوبۃ الافتراق علی امۃ الواحدۃ"
—— (اُمّتِ واحدہ پر فرقہ بندی کا عذاب) ——
مصنف ہیں السید احمد السیفی۔ اور ناشر مطبعۃ المنزل۔ قاہرہ۔ کتاب اپنے موضوع پر مفید اور دلچسپ ہے۔
ذیل میں اس کی تلخیص اور ترجمہ پیش کیا جاتا ہے جو سید نصیر شاہ صاحب (میانوالی) کے قلم کا رہین ہے۔ طلوع اسلام)

یہ سوال ایک سوچنے والے ذہن کو اکثر پریشان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عطا فرمودہ دینِ قیم میں اختلاف و افتراق کہاں سے راہ پا گیا۔ وہ سوتا جو اپنے منبع سے صاف اور بے میل پھوٹا تھا وہ کس طرح مختلف نالوں میں بٹ کر اپنی اصلی حالت کو کھو بیٹھا وہ امتِ واحدہ جو دنیا کو اتحاد و اتفاق کی دعوت دینے آئی تھی کیونکر افتراق کا شکار ہو گئی۔ اس سوال کے جواب میں زبان و قلم کا کافی زور صرف ہو چکا ہے اور ہمیں بتایا گیا ہے کہ طبائع کا اختلاف ایک فطری امر ہے۔ اور پھر ذہنی اور فکری استعداد میں بھی افرادِ نسلِ انسانی باہم مختلف ہیں۔ اس لئے نتائجِ فکر کا اختلاف کوئی مذموم چیز نہیں ؎

گلہائے رنگارنگ سے ہے زینتِ چمن　　اے ذوق اس چمن کو ہے زیب اختلاف سے

نتائجِ فکر کا اختلاف اگر حکمت و فلسفہ کے میدان میں ہوتا تو یہ عذر معقول تھا لیکن یہ اختلاف تو اس شریعت میں ہے جو افرادِ انسانی کو ایک لڑی میں پرو کر وحدتِ فکر و عمل پیدا کرنے کے لئے آئی تھی۔ اس اختلاف کی حدود تو یہاں تک وسیع ہیں کہ

ہماری تمدنی و معاشرتی زندگی کا کوئی گوشہ اس کی دستبرد سے محفوظ نہیں۔ ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دینے والا اگر اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھے ہوئے ہے تو وہ ایک فرقہ کے نزدیک زنا جیسے جرم عظیم کا مرتکب ہوتا ہے۔ اور دوسرے فرقہ کے نزدیک وہ تینوں طلاقیں ایک ہی طلاق کا حکم رکھتی ہیں اور وہ کسی طرح قصور وار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ پس اس جواب سے مطمئن ہو جانا بے معنی سی بات ہے۔

میں نے بھی اپنے طور پر اختلافات کے اسباب کا کھوج لگانے کی کوشش کی ہے۔ اس کوشش کا ثمر آپ کے سامنے ہے میں محض اسباب اختلاف بیان کروں گا۔ کسی کو مطعون کرنا میرا کام نہیں۔ اگر آپ کو ان اسباب سے اتفاق ہو تو پھر تدارک کی کوشش بھی ہو سکتی ہے۔

قرنِ اوّل میں وحدتِ اُمّت

جہاں تک اختلافات کا تعلق ہے اس حقیقت باہرہ سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ نبی صلعم کے دورِ مقدس میں ان کا سرے سے کوئی وجود ہی نہ تھا۔ صحابہ کرامؓ سمع و طاعت کے پیکر تھے ان کے قلوب ایک تسبیح میں پروئے ہوئے تھے۔ اسی یگانگت اور اتحاد کے باعث توحید کے وہ اولین علمبردار دنیائے انسانیت پر چھا گئے۔ رحمتِ عالم کی رحلت کے بعد ہی اختلافات کا سراغ ملتا ہے اور پھر خیر القرون کے گزرنے کے بعد تو افتراق کا یہ دروازہ ایسا چوپٹ کھلا کہ اس کے کواڑ آج تک ایک دوسرے سے دور ہی ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ سرور کائنات صلعم اپنے بعد دو چیزیں چھوڑ گئے تھے۔ ایک "کتاب" اور دوسری "سنت"۔ جہاں تک کتاب اللہ کا تعلق ہے تو یہ امر روز روشن کی طرح واضح ہے کہ پیغمبرِ انسانیت کی وفات کے وقت قرآن حکیم کے کئی نسخے موجود تھے اور صحابہؓ کے مقدس سینوں میں بھی خدائے قدوس کی یہ عظیم امانت محفوظ تھی۔ کسی آیت کے متعلق شبہ تو کجا کسی لفظ اور کسی حرف کے متعلق بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں ادنیٰ سا تغیر بھی آگیا ہے۔ اس میں ایک نقطہ اور ایک شوشہ کی کمی بیشی بھی نہیں ہو سکی کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خدائے جبار و عزیز نے اپنے ذمہ لیا تھا۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ ۔

بیشک ہم نے ہی قرآن حکیم کو نازل کیا۔ اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

جس چیز کی حفاظت خدائے قدوس کے ذمہ ہو کون ہے جو اس میں کمی بیشی کا احتمال کر سکتا ہو۔

قرآن کی حفاظت

پھر خدا ہمارے اسلاف کو مقبولیت کا شرف عطا فرمائے جنہوں نے قرآن حکیم کے حروف و اعراب تک گن کر رکھ دیئے۔ آج یہ امانت عظمیٰ اس حالت میں ہمارے پاس ہے کہ ہمیں اس قدر بھی معلوم ہے کہ کتاب اللہ میں (ا) ۴۸۸۷۲ ہیں (ب) ۱۱۲۲۸ ہیں۔

(ت) ۱۱۹۹ ہیں (ث) ۱۲۷۶ ہیں۔ (ج) ۳۲۷۳ ہیں۔ (ح) ۹۷۳ ہیں۔ (خ) ۲۴۱۶ ہیں۔ (د) ۵۶۴۲ ہیں۔ (ذ) ۴۶۹۷ ہیں۔ (ر) ۱۱۷۹۳ ہیں۔ (ز) ۱۵۹۰ ہیں (س) ۵۸۹۱ ہیں (ش) ۲۲۵۳ ہیں۔ (ص) ۲۰۱۳ ہیں۔ (ض) ۱۶۰۷ ہیں (ط) ۱۲۷۴ ہیں (ظ) ۸۴۲ ہیں۔ (ع) ۹۲۲۰ ہیں (غ) ۲۲۰۸ ہیں (ف) ۸۴۹۹ ہیں۔ (ق) ۶۸۱۳ ہیں۔ (ک) ۹۵۲۲ ہیں۔ (ل) ۳۴۳۲ ہیں۔ (م) ۲۶۵۳۵ ہیں۔ (ن) ۲۶۵۶۰ ہیں (و) ۲۵۵۳۶ ہیں۔ (ہ) ۱۹۰۷۰ ہیں (لا) ۳۷۲۰ ہیں۔ (ء) ۴۱۱۵ ہیں (ی) ۲۵۹۱۹ ہیں۔ کتاب اللہ میں ۵۳۲۴۲ زبر، ۳۹۵۸۲ زیر، ۸۸۰۴ پیش، ۱۷۷۱ مد اور ۱۲۵۲ شد ہیں۔

دنیا میں یہی ایک بے مثال کتاب ہے۔ جس کے حروف و اعراب تک شمار کر لیے گئے ہیں۔ یہ کتاب اس وقت بھی محفوظ تھی اور آج بھی محفوظ ہے اور قیامت تک محفوظ رہے گی۔

لیکن سنت کا حال اس سے بالکل مختلف ہے۔ کتاب اللہ کی کتابت کے لئے تو باقاعدہ کاتبین وحی تھے۔ جس وقت آیت نازل ہوتی تھی اس وقت حضور سرور کائنات کے حکم سے لکھ لی جاتی تھی۔ لیکن آپؐ کے زمانہ میں سنت کی کتابت نہ ہوئی بلکہ آپ نے احادیث لکھنے سے منع فرما دیا تھا۔ حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ نبی صلعم نے فرمایا۔

لا تکتبوا عنی، ومن کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ۔ (صحیح مسلم)

مجھ سے کوئی چیز نہ لکھو اور جس نے قرآن کے سوا کوئی چیز لکھی ہو اسے چاہیئے کہ اسے مٹا دے۔

احادیث کی پوزیشن

اس طرح سنت قرآن کی طرح کتابت میں نہ آئی اور صرف صحابہ کرامؓ کے سینوں میں محفوظ رہی۔ لیکن یہاں بھی کتاب و سنت میں بڑا فرق تھا۔ کیونکہ قرآن حکیم کے اصل الفاظ حفظ کئے جاتے تھے۔ نہ کوئی مترادفات استعمال کرتا اور نہ قرآن کے مفہوم کو اپنے الفاظ میں بیان کرنے کی کوشش کرتا۔ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۔ کی بجائے اگر ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا شَكَّ فِيْهِ ۔ کہہ دیا جائے تو کوئی بھی موخر الذکر جملہ کو قرآن حکیم کی آیت نہیں کہہ سکتا۔ لیکن سنت کی حالت اس کے بالکل برعکس ہے۔ صحابہؓ حضورؐ کے اقوال سن کر انہیں اصل الفاظ میں حفظ نہیں کرتے تھے بلکہ انہیں اپنے الفاظ میں بیان کیا کرتے تھے یہ روایات، روایات بالمعنی تھیں۔ اسی لئے صحابہ کرامؓ حدیث بیان کرنے کے بعد أوْ كَمَا قَالَ۔ (آپؐ نے اس قسم کے الفاظ فرمائے) کہہ دیا کرتے تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ حضورؐ کے بعض خطبات اصل الفاظ میں بھی محفوظ ہیں۔ مگر عام روایات کی یہ حالت نہیں۔ ان معنوی روایات کی بھی یہ حالت تھی کہ صحابہؓ احادیث کا مفہوم اپنی فہم کے مطابق متعین کیا کرتے تھے اور پھر اپنے اخذ کردہ مفہوم کو اپنے الفاظ میں بیان کرتے تھے۔ پھر چونکہ انسانی اذہان بھی ایک جیسے نہیں ہوتے، اس لئے ایک ہی روایت سے دو مختلف صحابہؓ مختلف مطالب اخذ کرتے تھے اس سے صحابہؓ کا اختلاف رونما ہوا۔

سماع موتی کے مسئلہ کو لیجئے۔ امام بخاریؒ نقل کرتے ہیں۔

عن ابن عمرؓ اطلع النبی علیہ السلام اھل القلیب فقال ھل وجدتم ما وعد ربکم حقا فقیل لہ۔

ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبیؐ نے بدر کے کافر مردوں کو مخاطب کرکے فرمایا "کیا تم نے پالیا کہ اللہ کا وعدہ سچا تھا" کسی نے عرض کیا۔

اتدعوا امواتا قال ما انتم باسمع منھم ولکن لا یجیبون (بخاری شریف)

"حضور! کیا آپ مُردوں کو مخاطب کر رہے ہیں" آپ نے فرمایا۔ تم ان سے زیادہ نہیں سنتے لیکن یہ جواب نہیں دیتے۔

اسی روایت کی بنا پر حضرت ابن عمرؓ اور بعض دیگر صحابہؓ سماع موتی کے قائل ہیں لیکن یہی روایت جب حضرت عائشہؓ کے سامنے بیان کی گئی تو انہوں نے فرمایا کہ "ما انتم باسمع منھم" (تم ان سے زیادہ نہیں سنتے) سے حضورؐ کا مطلب ہے "ما انتم باعلم منھم" (تم ان سے زیادہ نہیں جانتے یعنی انہیں اب معلوم ہو چکا ہوگا۔ کیونکہ خدا خود کہتا ہے اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی ـــــ (آپ مُردوں کو نہیں سنا سکتے۔) اسی طرح عقائد کے ساتھ ساتھ اعمال میں بھی اختلافات پیدا ہونے لگے۔ صرف وضو اور نماز میں جو اختلافات رونما ہو گئے ان کا ہلکا سا اندازہ اس مختصر سی تفصیل سے لگا لیجئے ـــ

(ا) وضو میں اعضاء ایک ایک بار دھولے چاہئیں ـــ (عبداللہ بن عباسؓ)
دو دو بار دھونے چاہئیں ـــ (ابوہریرہؓ)

(ب) آگ پر پکی ہوئی چیز کے استعمال سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ (ابوہریرہؓ)
نہیں ٹوٹتا ـــــ (جابرؓ، عبداللہ بن مسعودؓ)

(ج) فجر کی نماز منہ اندھیرے پڑھ لینی چاہیئے ـــ (عائشہؓ)
اسفار کرنا چاہیئے۔ (انسؓ)

(د) عصر میں جلدی کرنی چاہیئے ـــ (عائشہؓ)
تاخیر کرنی چاہیئے ـــ (ام سلمہؓ)

(ہ) فجر میں دعائے قنوت پڑھنی چاہیئے ـــ (علیؓ۔ ابن عباسؓ۔ ابوہریرہؓ)۔
نہیں پڑھنی چاہیئے ـــ (ابومالک اشجعیؓ)

(۱) مسح علی العمامہ جائز ہے۔ (ابوبکرؓ۔ عمرؓ۔ انسؓ۔ ابو الدرداءؓ)
جائز نہیں۔ (بعض دیگر صحابہؓ)
(۲) مسح علی الخفین جائز ہے۔ (اکثر صحابہؓ)
جائز نہیں۔ (عائشہؓ۔ ابن عباسؓ)

ظاہر ہے کہ یہ اختلافات قرآنی آیات سے نہیں بلکہ روایات سے پیدا ہوئے تھے۔ لیکن اس قسم کے بیسیوں اختلافات کے باوجود کوئی نیا فرقہ وجود میں نہیں آیا۔ اور امت کا اجتماعی نام اُمّتِ مسلمہ ہی رہا۔

ایک عظیم نکتہ

غور کیجئے تو یہاں سے ایک عجیب نکتہ سامنے آئے گا۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ صحابہ کرامؓ اپنی فہم کے مطابق احادیث سے مفہوم اخذ کیا کرتے تھے۔ اور پھر اس مفہوم کو اپنے الفاظ میں بیان کر دیا کرتے تھے۔ اب یہ کہنے کی کیا صورت ہو سکتی تھی کہ واقعی حضورؐ نے اسی مفہوم میں یہ قول ارشاد فرمایا تھا۔ اگر قرآن کی طرح حضورؐ کے اقوال اصل الفاظ میں بیان کئے جاتے تب تو معاملہ صاف تھا مگر مشکل یہ تھی کہ حضورؐ کے اقوال اصل الفاظ میں محفوظ نہیں تھے۔ پس کسی صحابیؓ کے منہ سے حضورؐ کی روایت سن کر اسکے اصل مفہوم تک پہنچنے تک صحابہؓ کے پاس صرف دو معیار تھے۔ ایک "قرآن" اور دوسرے "درایت"۔ رہی راویوں کی چھان پھٹک تو اس کا اس وقت سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ ہم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ معاذ اللہ کوئی صحابیؓ رسولِ خدا صلعم پر بہتان باندھنے لگے۔ پس صحابہؓ انہی دو معیاروں پر روایت کو پرکھ لیا کرتے تھے۔ سماعِ موتیٰ کے مسئلہ میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے جب ابن عمرؓ کی روایت کا مفہوم متعین کیا ہے تو قرآن کی آیت اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى ——— اپنی دلیل میں پیش فرمائی ہے۔ اسی طرح جب حضرت ابن عباسؓ یہ روایت بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلعم نے معراج میں اللہ تعالیٰ کو دیکھا تھا تو حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں "ہرگز نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ (آنکھیں اس کو نہیں پا سکتیں) اسی طرح جب حضرت ابوہریرہؓ کی روایت انہیں پہنچی کہ "رسولِ خدا صلعم نے فرمایا کہ میت کے وارثوں کی طرف سے کئے گئے گریہ و ماتم کی وجہ سے مُردوں کو عذاب ہوتا ہے" تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا یہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى - (ایک کے گناہ کا دوسرے شخص سے مواخذہ نہیں ہو سکتا)

ان تمام روایات کو قرآنی معیار پر پرکھ کر حضرت عائشہؓ نے اپنے فیصلے صادر فرمائے تھے۔ لیکن جن معاملہ میں قرآن خاموش ہوتا اس میں درایت سے کام لیا جاتا تھا۔ چنانچہ جب حضرت ابوہریرہؓ نے روایت کی کہ نبی صلعم نے فرمایا "آگ کی پکی ہوئی چیز کے کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے" تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرمانے لگے "اگر ایسا

ہوتا تو گرم پانی کے استعمال سے بھی وضو ٹوٹ جاتا۔ علامہ سیوطیؒ نے ایک رسالہ میں ایسی روایات کو جمع کیا ہے جن میں حضرت عائشہؓ نے نشان دہی کی ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے اقوالِ رسولؐ بیان کرنے میں کیونکر دھوکا کھایا۔

کتاب اور سنت کا فرق بیان کرتے ہوئے بحث قدرے طویل ہوگئی۔ لیکن اس سے یہ چند نکات سامنے آ گئے کہ

(ا) کتاب کی حفاظت کا جتنا اہتمام ہوا، سنت کی حفاظت کا اس قدر اہتمام ضروری نہیں سمجھا گیا۔

(ب) روایات کا باہمی اختلاف صحابہؓ کے زمانہ میں ہی پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن ان لوگوں کے پاس روایت کو پرکھنے کے دو معیار تھے۔ قرآن اور درایت۔ اور یہ نہیں کیا جاتا تھا کہ روایت سے قرآن کے حکم کو مخصوص یا مقید یا منسوخ سمجھا جائے۔ بلکہ اس کی بجائے قرآن کے مقابلہ میں روایت کو ہی ناقابلِ قبول سمجھا جاتا تھا۔ ان نکات کو ذہن میں رکھئے اور آگے چلئے۔

بعد کے زمانے میں

برسوں بعد جب یہ مختلف روایات محدثین تک پہنچیں تو انہوں نے اپنی فہم کے مطابق جن روایات کو درست پایا۔ انہیں قبول کر لیا۔ اور جنہیں غلط سمجھا انہیں رد کر دیا۔ اپنے اس بیان کی توضیح کے لئے میں صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا۔

امام بخاریؒ باب قول تعالیٰ نساءکم حرث لکم میں ابن عمرؓ کی روایت بیان کرتے ہیں کہ وطی قبل اور دبر میں جائز ہے لیکن ترمذی، ابوداؤد، نسائی میں ایسی احادیث مذکور ہیں، جو وطی فی الدبر کی حرمت پر شاہد ہیں۔ اس قسم کی سینکڑوں روایات ہیں جو ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہیں۔ فقہائے چونکہ اپنے تفقہ کی بنیاد احادیث پر رکھی تھی۔ اس لئے جس فقیہ نے اپنی دانست میں کسی حدیث کو صحیح سمجھا اس پر عمل کر لیا اور جسے غلط سمجھا یا جو روایت اسے نہ پہنچی اس پر عمل نہ کیا۔

تدوین احادیث کے سلسلے میں محدثین بھی چونکہ انسان تھے اس لئے ان سے خطائیں سرزد ہوئیں۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ امام بخاریؒ حالانکہ چند واسطوں سے امام اعظمؒ کے شاگرد ہیں لیکن ان کی کسی روایت کو اپنی کتاب میں جگہ نہیں دی۔ محض اس لئے کہ امام اعظمؒ ایمان بلا عمل کے قائل تھے۔ اور امام بخاریؒ اعمال کو جزوِ ایمان سمجھتے تھے۔ بلکہ امام بخاریؒ تو امام اعظمؒ سے اس قدر ناراض ہیں کہ انہیں اُن کے شاگردوں کو بعض مقامات پر زندیق۔ مرجیہ۔ رائی المذہب۔ بعض الناس۔ فسادی۔ شرارتی اور باغی تک لکھ گئے ہیں[1]۔ (دیکھئے تاریخ صغیر للبخاری۔ بخاری۔ اعتصام) اسی لئے علامہ عینیؒ لکھتے ہیں:-

---

[1] یہاں دیگ اور صاحب کے الفاظ بھی ملاحظہ فرمائیے۔ "امام بخاری کی عداوت اس لئے امام صاحب کے ساتھ ہوئی اور ہر جگہ بخاری میں امام صاحب کو بعض الناس سے یاد کیا کہ امام بخاریؒ کے گرد امام محمدؒ کے تھے انہوں نے امام بخاریؒ کو فتوے دینے سے منع کیا کہ تم فتوے دینے کے قابل نہیں۔ چنانچہ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ امام بخاریؒ نے لوگوں سے مسئلہ دریافت کیا کہ اگر لڑکی اور لڑکا دل کر ایک بکری یا گائے کا دودھ پی لیں تو ان میں حرمت رضاعت ثابت ہو گی یا نہ۔ اسی وقت لوگوں نے انہیں ملک بخارا سے نکال دیا۔ اور اسی بنا پر بخاری کے دل میں ایک ذاتی قسم کی عداوت امام صاحبؒ کے ساتھ اور ان کے متبعین کے ساتھ ہو گئی۔" (سلطان الفقہ ج ۵ ص ۳۵ مصنفہ مولانا محمد نظام الدین صاحب حنفی قادری سروری ملتانی از خلفائے سلطان باہوؒ)

ما قالہ البخاریؒ فی تاریخہ فی حق ابی حنیفہ مما لا ینبغی فی حق من اطراف الناس فضلاً ان یقال فی حق امام ھو احد ارکان الدین

(عمدۃ القاری ج ۴ صـ۴۵۲)

بخاریؒ نے اپنی "تاریخ" میں ابو حنیفہؒ کے حق میں جو کلمات استعمال کئے ہیں وہ ایسے ہیں جو کسی ادنیٰ آدمی کے حق میں لکھنے بھی مناسب نہیں۔ چہ جائیکہ ایک ایسی شخصیت کے حق میں لکھے جائیں جو ارکان دین میں سے ایک رکن ہو۔

یہاں یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحبؒ کوئی غیر ثقہ آدمی نہیں تھے کہ امام بخاریؒ نے ان سے روایت کرنا مناسب نہ سمجھا ہو۔ امام صاحب بلند پایہ تابعی ہیں وہ اسود۔ علقمہ۔ عطا۔ عکرمہ۔ مجاہد۔ مکحول اور حسن بصری جیسے ثقہ حضرات (رضی اللہ عنہم) سے روایت کرتے ہیں۔ علامہ ابن حجر مکی لکھتے ہیں۔

وقال علی ابو حنیفہ روی عنہ الثوری وابن المبارک وحماد بن زید وھشیم ووکیع بن الجراح وعباد بن العوام وجعفر بن عون وھو ثقہ

(خیرات الحسان صـ ۶۸)

علی بن مدائنی نے کہا کہ ابو حنیفہؒ ثقہ ہیں ان سے سفیان ثوری، عبداللہ بن مبارک، حماد بن زید، ہشیم، وکیع بن الجراح، عباد بن العوام اور جعفر بن عون جیسے لوگ روایت کرتے ہیں۔

ایک اور جگہ لکھا ہے۔

قال شعبہ واللہ کان ابو حنیفہ حسن الفہم جید الحفظ

(ایضاً صـ ۳۹)

امام شعبہؒ نے کہا واللہ ابو حنیفہؒ فہم میں بہت اچھے اور حافظہ میں بہت جید ہیں۔

لیکن امام اعظمؒ کی اس عظمت کے باوجود نہ معلوم امام بخاریؒ نے کیوں ان سے کوئی روایت نہیں لی۔ جو لوگ یہ کہا کرتے ہیں کہ امام اعظمؒ کو احادیث یاد نہیں تھیں ان کے لئے میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ علامہ ذہبی نے انہیں حفاظ حدیث میں شمار کیا ہے۔ عوام الناس کا یہ خیال بھی مجھے صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ امام بخاریؒ، امام اعظمؒ کو مرجیہ سمجھتے تھے۔ اس لئے ان سے روایت نہیں لیتے۔ کیونکہ بخاری شریف میں مرجیہ، جہمیہ وغیرہ عقائد کے لوگوں کی روایات لی ہیں۔ ذرا ایک نظر اس تفصیل کو ملاحظہ فرمائیے۔

بخاری شریف کے جہمیہ راوی

بشیر بن فری جہمیہ تھا (میزان الاعتدال، صـ۱۴۵) قطر بن خلیفہ جہمیہ تھا۔ (تہذیب التہذیب ج ۵) یحییٰ بن صالح جہمیہ تھا۔ (تہذیب التہذیب) علی بن الجواد جہمیہ تھا۔ (تہذیب التہذیب) جہمیہ قرآن

کو مخلوق سمجھتے تھے۔

اب ان لوگوں کے متعلق فرمایا اقوال بھی ملاحظہ فرما لیجئے۔ وکیع بن الجراح کا قول ہے۔

من زعم ان القرآن محدث فقد کفر۔

(الاسماء والصفات۔ للبیہقی)

جس شخص نے قرآن کو حادث خیال کیا وہ کافر ہے۔

علامہ عبدالرحمٰن بن مہدی کہتے ہیں۔

لو رأیت رجلا علی الجسر وبیدی سیف یقول القرآن مخلوق ضربت عنقہ (ایضاً)

اگر میرے ہاتھ میں تلوار ہو اور کسی کو پل پر یہ کہتے سن لوں کہ قرآن مخلوق ہے تو اس کی گردن مار دوں۔

علامہ یزید بن ہارون کا قول ہے۔

من زعم ان کلام اللہ مخلوق فھو واللہ الذی لا الٰہ الا ھو عندی زندیق (ایضاً)

جس شخص نے یہ گمان کیا کہ قرآن مخلوق ہے۔ خدا کی قسم وہ زندیق ہے۔

امام مزنی شاگرد امام شافعیؒ فرماتے ہیں۔

من قال ان القرآن مخلوق فھو کافر۔ (ایضاً)

جس شخص نے کہا قرآن مخلوق ہے وہ کافر ہے۔

ان کو تو رہنے دیجئے۔ اب خود امام بخاریؒ[1] کا قول سنئے جنہوں نے جہمیہ کا نام تک لے دیا ہے۔

نظرت فی کلام الیھود والنصاریٰ والمجوس فما رأیت قوما اضل فی کفرھم من الجہمیہ وانی لاستجھل من لا یکفرھم۔ (ایضاً)

میں نے یہودیوں، عیسائیوں اور مجوسیوں تک کے کلام دیکھے ہیں لیکن ان میں سے کوئی فرقہ بھی اپنے کفر میں جہمیہ سے زیادہ گمراہ نہیں۔ میں اسے جاہل سمجھتا ہوں جو جہمیہ کو کافر نہ سمجھے۔

بہرحال ایسے لوگوں سے بھی امام صاحب نے روایتیں لی ہیں۔

---

[1] امام بخاریؒ خود بھی اس حد تک عقیدہ رکھتے تھے کہ قرآن مخلوق نہیں مگر اس کا تلفظ مخلوق اور حادث ہے۔ امام ذہلیؒ جو امام بخاریؒ کے استاد ہیں اور صحیح بخاری میں ان کی روایت سے بہت سی حدیثیں مذکور ہیں۔ انہوں نے جب یہ سنا تو عام حکم دے دیا کہ جو شخص یہ کہے "لفظی بالقرآن مخلوق" وہ ہماری مجلس میں نہ آنے پائے۔ (علامہ ابن حجرؒ کی شرح بخاری دیکھئے۔)

بخاری شریف کے مرجیہ راوی

محدثین کے نزدیک مرجیہ ایسا گمراہ فرقہ تھا کہ اس کی شہادت بھی مقبول نہ تھی۔ مگر بخاری شریف میں مرجیہ راویوں کی روایات بھی ہیں مثال کے طور پر دیکھئے۔

شبابہ بن سوار الفزاری مرجیہ تھا (تہذیب التہذیب ج ۴) عبدالحمید بن عبدالرحمٰن الحمانی مرجیہ تھا۔ (ایضاً ج ۶) عثمان بن غیاث البصری مرجیہ تھا۔ (ایضاً ج ۱۱) یونس بن ابی اکبر مرجیہ تھا (ایضاً) ابراہیم تیمی۔ سالم بن عجلان، قیس بن مسلم الجدلی خالد بن یحییٰ بن صفوان بشر بن محمد سختیانی۔ ابراہیم بن طہمان اور امام بخاریؒ کے استاد سلیمان بن مہران اور ابراہیم نخعی سب مرجیہ تھے (تقریب التہذیب ج ۱)۔

بخاری شریف کے شیعہ راوی

اسمٰعیل بن ابان شیعہ تھا (تہذیب التہذیب ج ۱) خالد بن مخلد القطوانی شیعہ تھا (ایضاً ج ۳) سعید بن عمرو شیعہ تھا۔ (ایضاً ج ۴) جریر بن عبدالحمید شیعہ تھا۔ (ایضاً ج ۲) سعید بن فیروز شیعہ تھا (ایضاً ج ۴)۔

بخاری شریف کے قدریہ راوی

یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ محدثین قدریہ کے لفظ کا اطلاق معتزلہ پر کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ محدث سمعانی نے کتاب الانساب میں نظام کو قدریہ لکھا ہے۔ اور علامہ ابن قتیبہ نے کتاب المعارف میں معتزلہ کا نام تک نہیں لیا۔ بلکہ اس کی بجائے قدریہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ معتزلہ بھی خلق قرآن کے قائل تھے۔ ان کے اور محدثین کے اختلافات تو ہر ایک کو معلوم ہیں مگر ایسے عقائد رکھنے والوں کی روایات بھی بخاری شریف میں موجود ہیں۔

ثور بن یزید قدریہ تھا (تہذیب التہذیب ج ۲) حسان بن عطیہ المحاربی قدریہ تھا۔ (ایضاً ج ۲) زکریا بن اسحٰق قدریہ تھا (ایضاً ج ۲) حسن بن ذکوان قدریہ تھا (ایضاً ج ۲) سعید بن عبدالعزیز قدریہ تھا۔ (ایضاً ج ۴) عبداللہ قدریہ تھا (ایضاً ج ۵)۔

بخاری شریف کے خارجی راوی

خارجیوں کے نام تک سے آج بھی نفرت کی جاتی ہے مگر بخاری شریف میں ان لوگوں کی روایات کو بھی جگہ ملی ہے۔ عکرمہ مولیٰ ابن عباس خارجی تھا (ایضاً ج ۷) ولید بن کثیر خارجی تھا۔ (ایضاً ج ۱۱) عمران بن حطان خارجی تھا (ایضاً ج ۸) داؤد بن الحصین شراۃ کا مذہب رکھتا تھا (ایضاً)

بخاری شریف کے وہ راوی جو حضرت علیؓ کے دشمن تھے

اسحٰق بن سوید العدوی حضرت علیؓ پر حملے کیا کرتا تھا (ایضاً ج ۲) حصین بن الواسطی حضرت علیؓ کا دشمن تھا (ایضاً ج ۲) قیس بن ابی حازم کا بھی یہی حال تھا۔ (ایضاً ج ۸)۔

بات چل پڑی ہے تو اب علامہ ابن الصلاح کا یہ قول بھی سنتے جائیے۔

فان کتبھم طافحۃ بالروایۃ عن المبتدعۃ غیر الدعاۃ
(فتح المغیث شرح الفیۃ الحدیث ص۱۴۲)

محدثین کی تصانیف غیر داعی بدعتیوں کی روایتوں سے بھری ہوئی ہیں۔

نہ معلوم ایسے راویوں کے ہوتے ہوئے امام اعظمؒ سے کیوں اغماض برتا گیا۔ خیر ان تفاصیل میں پڑ کر ہم اصل بحث سے دور نکل آئے۔ لیکن غور کیجئے۔ تو راویوں کی ان طویل فہرستوں سے ہمارے اصل دعوی کو تقویت ملی ہے کہ محدثین نے اپنی فہم کے مطابق جس روایت کو صحیح سمجھا اسے قبول کرلیا۔ اور جسے غلط سمجھا اسے رد کردیا۔ یہی وجہ ہے کہ احادیث کی کتابوں میں ضعیف حدیثیں بھی راہ پاگئیں۔ چنانچہ بخاری شریف جیسی کتاب بھی ضعیف روایات سے خالی نہیں۔ مسلم شریف کا بھی یہی حال ہے۔ چنانچہ صاحب فتح المغیث نے حاکم نیشاپوری کا یہ قول تاریخ نیشاپور سے نقل کیا ہے کہ

ان کتاب مسلم ملآن من الشیعۃ (فتح المغیث شرح الفیۃ الحدیث ص۱۴۲)

مسلمؒ کی کتاب مسلم شریف شیعی رواۃ سے بھری ہوئی ہے۔

اگر یہاں مسلم شریف کے چند ضعیف راویوں کا بھی تذکرہ کردیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔

مسلم شریف کے ضعیف راوی

احمد بن عبدالرحمٰن کا حافظہ خراب ہوگیا تھا۔ (تقریب التہذیب) ربانی بن تغلب پر شیعہ ہونے کی وجہ سے کلام کیا گیا۔ (ایضاً) ابراہیم بن مہاجر بن جابر کا حافظہ خراب تھا (ایضاً) ابراہیم بن یوسف بن اسحاق نہایت وہمی تھا۔ (ایضاً) اسحٰق بن منصور السلولی پر شیعہ ہونے کی وجہ سے کلام کیا گیا۔ (ایضاً) اسمٰعیل بن ریان الورق کی بھی یہی حالت تھی۔ (ایضاً)۔ اسمٰعیل بن رافع کا حافظہ کمزور تھا (ایضاً) اسمٰعیل بن ریاح مجہول الحال ہے۔ (ایضاً) اسمٰعیل بن عبداللہ روایت بیان کرنے میں خطا کرتا تھا۔ (ایضاً) ——— اسمٰعیل بن ابی کرایہ شیعہ اور وہمی تھا ——— (ایضاً) اشوث بن سوار الکندی ضعیف تھا۔ (ایضاً)

یہ چند راوی محض مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر پیش کئے گئے ہیں ورنہ حالت یہ ہے کہ

ان الرجال الذین تکلم فیھم من الرجال مسلم اکثر عددا من الرجال الذین تکلم فیھم من رجال البخاری۔ (نخبۃ الفکر ص۲۹)

مسلم کے جن راویوں میں کلام کیا گیا ہے وہ تعداد میں بخاری شریف کے متکلم فیہ راویوں سے زیادہ ہیں۔

لہ ثبوت کے لئے دیکھئے نصرۃ المجتہدین، شرح نخبہ ملا علی قاری۔ شرح نخبہ ابن حجر مکی۔ تذکرۃ الموضوعات محمد طاہر پٹنی، الاجوبۃ الفاضلہ عن الاسئلۃ العشرۃ الکاملہ۔ مولوی عبدالحی۔

علامہ ملا علی قاری فرماتے ہیں۔

فان الذین انفرد بخاری بہم اربع مائۃ وخمسۃ وثلثون رجلا والمتکلم فیہم بالضعف نحو من ثمانین رجلا والذین انفرد بہم مسلم است مائۃ وعشرین رجلا والمتکلم فیہم مائۃ وستون رجلا علی الضعف (شرح نخبۃ الفکر علامہ ملا علی قاری)

بخاریؒ نے ۴۳۵ راویوں سے روایتیں لی ہیں۔ جن میں سے ۸۰ راویوں پران کے ضعف کے باعث کلام کیا گیا اور مسلم کے کل راوی ۶۲۰ ہیں جن میں سے ۱۶۰ پران کے ضعف کے باعث کلام کیا گیا۔

غرضیکہ جب صحیحین بھی ضعف سے خالی نہیں تو دیگر کتابوں کا کیا ذکر۔ یہاں میں نے عمداً محدث جوزی کی تصریحات نظر انداز کر دی ہیں کیونکہ انہیں حدیث کے معاملہ میں متشدد سمجھا جاتا ہے۔ بہر حال ہم کہنا یہ چاہتے تھے کہ سنت کتاب اللہ کی طرح محفوظ نہ رہی اور صدیوں بعد تک اس کی تدوین ہوتی رہی لیکن آج تک ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ فلاں کتاب کی روایات کتاب اللہ کی مثل شک و شبہ سے بالاتر ہیں۔

اسماء الرجال

محدثین کا زمانہ آیا تو موضوعات بکثرت شائع ہو چکی تھیں اس لئے ان کی چھان پھٹک کے لئے اسماء الرجال کا عظیم الشان علم وجود میں آیا۔ اور ایک ایک راوی کے حالات زندگی کی جانچ پڑتال کی گئی۔ مختلف کتابیں محض اس فن پر تیار ہو گئیں۔ اسلاف کی یہ ہمت قابل داد ہے اور اسماء الرجال کی عظمت بجا ہے مگر پھر بھی چونکہ یہ انسانی کوشش تھی۔ اس لئے نقص وخطاء سے پاک شمار نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ یہاں بھی آپ قدم قدم پر انسانی لغزشوں کے نمونے دیکھیں گے۔ چنانچہ اسماء الرجال کے مشہور ماہر فن، صاحب میزان الاعتدال علامہ ذہبیؒ کے متعلق علامہ ابن السبکی لکھتے ہیں۔

ھذا شیخنا الذھبی لہ علم ودیانۃ وعندہ علی اھل السنۃ تحمل مفرط فلا یجوزان یعتمد علیہ وھو شیخنا ومعلمنا غیران الحق احق بالاتباع ——————— (طبقات ابن السبکی)

یہ ہمارے استاد ذہبیؒ عالم ہیں متدین ہیں باین ہمہ اہل سنت سے نہایت تعصب برتتے ہیں۔ اس لئے ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ اور ہمارے شیخ اور معلم ہیں لیکن حق بات پیروی کئے جانے کی زیادہ مستحق ہے۔

چونکہ یہ تمام حضرات بشری کمزوری سے مبرا نہیں تھے اس لئے بڑے بڑے اکابر ایک دوسرے کو ضعیف اور جھوٹا کہتے رہے۔

چنانچہ آپ اسماء الرجال کی مختلف کتابیں اٹھا کر دیکھئے تو آپ کا دماغ چکرا جائے گا۔ کیونکہ آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ ایک ہی راوی ہے مگر اسماء الرجال کی کتابوں میں سے کسی نے اسے ضعیف قرار دیا اور کسی نے نہایت قوی تسلیم کیا ہے۔

مغیرہ کی روایت ہے کہ جب میں نے حماد جیسے محتاط بزرگ سے علمائے حجاز کے متعلق پوچھا تو کہنے لگے۔

سألتهم فلم يكن عندهم شيئ والله لصبيانكم اعلم منهم بل صبيان صبيانكم ———— (جامع بیان العلم باب ایضاً)

میں نے ان لوگوں سے (علمائے حجاز سے) سوالات کئے تو ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اللہ گواہ ہے کہ تمہارے بچے بلکہ بچوں کے بچے بھی ان سے زیادہ علم رکھتے ہیں۔

جانتے بھی ہیں آپ کہ یہ حماد حضرت امام اعظمؒ کے استاد ہیں اور عطا، طاؤس، اور مجاہد جیسے ثقہ فضلاء کے متعلق ایسی رائے کا اظہار کر رہے ہیں۔

شعبی اور ابراہیم النخعی کی جلالتِ شان سے کون واقف نہیں مگر جب شعبی کے سامنے ابراہیم النخعی کا ذکر چھڑتا ہے تو کہتے ہیں۔

فذلك الاعور الذى يستفتنى بالليل ويجلس يفتى الناس بالنهار (ایضاً ص ۱۹۶)

وہی بھینگا؟ جو رات کو ہم سے مسائل پوچھتا ہے اور دن کو مفتی بن کر بیٹھا لوگوں کو فتوے دیتا ہے۔

اور شعبی کا تذکرہ جب ابراہیم النخعی کی محفل میں چلا کہ وہ مسروق سے روایت کرتے ہیں تو انہوں نے جھٹ کہہ دیا۔

ذالك الكذاب لم يسمع من مسروق شيئا۔ (ایضاً)

وہ جھوٹا ہے اس نے مسروق سے کچھ نہیں سنا۔

سعید بن جبیر جیسے سنجیدہ بزرگ بھی شعبی پر جھوٹا ہونے کا الزام دھرتے ہیں اور عکرمہ کے حق میں اپنے غلام سے کہتے ہیں۔

اتكذب على كما كذب عكرمة على ابن عباس۔

کیا تو بھی اسی طرح مجھ پر جھوٹ باندھنے لگا جس طرح عکرمہ نے ابن عباس پر جھوٹ باندھے تھے۔

اسی طرح عبداللہ بن المبارکؒ نے امام مالکؒ تک کو کہہ دیا کہ میں انہیں عالم نہیں سمجھتا۔ یحییٰ بن معین کی چوٹوں سے زہریؒ اوزاعیؒ ابو عثمان النہدی اور طاؤس جیسے لوگ نہ بچ سکے۔ حتیٰ کہ امام شافعیؒ تک کو انہوں نے کہہ دیا کہ

انه ليس بثقة (ایضاً ص ۳)

وہ ثقہ نہیں ہیں۔

امام اعظم صاحب کے متعلق بھی کس قدر متضاد روایات ہیں:

قیل لیحییٰ بن معین ھا ابابکر ابوحنیفۃ کان یصدق فی الحدیث قال نعم صدوق ۔ (نصرۃ المجتہدین ۔ صفحہ ۱۸۸)

یحییٰ بن معین سے کسی نے پوچھا۔ اے ابوبکر کیا ابوحنیفہ روایت میں سچے تھے؟ انہوں نے کہا ہاں وہ صدوق تھے۔

اس کے بالکل برعکس۔

قال ابن المبارک کان ابوحنیفۃ یتیماً فی الحدیث (قیام اللیل للمروزی صفحہ ۱۲۳)

عبداللہ بن المبارک نے کہا کہ ابوحنیفہ حدیث میں یتیم تھے۔

ایک طرف ان کے متعلق ابن حجر مکی شافعیؒ فرماتے ہیں۔

مر انہ اخذ عن اربعۃ آلاف شیخ من ائمۃ التابعین وغیرھم ومن ثم ذکرہ الذھبی وغیرہ فی طبقات الحفاظ من المحدثین ۔ (خیرات الحسان)

یہ بات گزر چکی ہے کہ امام صاحب نے چار ہزار ائمہ تابعین وغیرہم سے روایت کی ہے اس لئے علامہ ذہبیؒ اور دوسرے حضرات نے انہیں حفاظ حدیث کے طبقات میں شمار کیا ہے۔

اور دوسری طرف خطیب بغدادی علم حدیث کی طرف سے امام اعظمؒ کی بے رغبتی اور بے اعتنائی خود ان کے الفاظ میں ہی بیان کرتے ہیں کہ

قلت فان سمعت الحدیث وکتبتہ حتی لم یکن فی الدنیا احفظ منی قالوا اذا کبرت وضعفت حدثت واجتمع علیک الاحداث والصبیان ثم لا تامن ان تغلط فیرمون بالکذب فیصیر حالک فی عقبک فقلت لا حاجۃ لی فی ھذا۔ (تاریخ بغداد ذکر ابوحنیفہ)

امام صاحب فرماتے ہیں میں نے لوگوں سے پوچھا کہ اگر میں علم حدیث حاصل کروں اور اس مرتبہ تک پہنچ جاؤں کہ مجھ سے زیادہ حافظ حدیث کوئی نہ ہو تو کیا انجام ہوگا۔ لوگوں نے کہا جب آپ بڑی عمر کو پہنچ کر احادیث بیان کریں گے اور نوجوان اور نوعمر لوگ انہیں سنیں گے تو لامحالہ کہیں نہ کہیں غلطی بھی ہو جائے گی تو لوگ آپ کو جھوٹا کہیں گے۔ اور آپ کا حال آپ کی وفات کے بعد بھی باقی رہے گا۔ جب میں نے یہ سنا تو کہا۔ پھر مجھے علم حدیث کی کوئی ضرورت نہیں۔

عراق علم و فضل کا مرکز رہا ہے۔ اور اگر ہم شمار کرنے بیٹھیں تو صحاح ستہ کے سینکڑوں راوی عراقی ہوں گے مگر

ان کے متعلق ذرا ان ائمہ و محدثین کے اقوال بھی سنئے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں۔

ایاکم والاخذ بالحدیث الذی اتاکم من بلاد اھل الرائے الا بعد التفتیش۔ (میزان شعرانی)

اہل رائے کے شہروں کی طرف سے جو حدیث بھی پہنچے اسے بغیر تحقیق کے بالکل قبول نہ کیا کرو۔

امام مالکؒ ائمہ احناف کی مخالفت یوں کہتے ہیں۔

کل حدیث جاء من العراق ولیس لہ اصل فی الحجاز فلا تقبلہ (تدریب الراوی صـ۵۳)

عراق کی طرف سے جو حدیث آئے اور حجاز میں اس کی اصل نہ پائی جاتی ہے اسے قبول نہ کرو۔

امام زہری تو عراقیوں سے اور بھی زیادہ ناراض ہیں۔

اذا سمعت بالحدیث العراقی فاردُدْ بہ

ثم اردد بہ ——————— (ایضاً)

جب بھی کوئی عراقی حدیث سنو اسے رد کردو، ہاں ہاں اسے رد کردو۔

امام طاؤس چار قدم اور آگے نکل گئے۔

اذا حدثک العراقی مائۃ حدیث فاطرح تسعۃ وتسعین (ایضاً)

عراق والے اگر سو حدیثیں بیان کریں تو ننا نوے بغیر ثابت ہوں گی۔

امام ہشام بن عروہ نے تو قصہ ہی تمام کر دیا۔

اذا حدثک العراقی بالف حدیث فالق تسعمائۃ وتسعین وکن من الباقی فی الشک ——— (ایضاً)

اگر عراقی ایک ہزار حدیثیں بیان کریں تو نو سو نوے کو تو بالکل چھوڑ دو رہیں باقی دس تو وہ بھی مشکوک ہوں گی۔

مشہور مورخ اسلام محمد بن اسحاق کے حق میں یہ متضاد آرا ملاحظہ فرمایئے۔ ان کے متعلق قتادہ کہتے ہیں۔

لایزال الناس فی علم ما عاش محمد بن اسحق - (اسباب اختلاف الفقہا صـ۹۲)

علم میں محمد بن اسحق کے درجہ کو کوئی نہیں پہنچا۔

محدث نسائی کہتے ہیں۔

لیس بالقوی ـــــــــــ (ایضاً)

وہ قوی نہیں تھا۔

سفیان ثوری کہتے ہیں۔

ما سمعت احداً یتھم محمد بن اسحٰق ـــــ (ایضاً)

میں نے کسی کے منہ سے نہیں سنا کہ وہ محمد بن اسحٰق پر ضعف کی تہمت لگائے۔

لیکن امام مالکؒ فرماتے ہیں۔

انہ کذاب (ایضاً)

وہ بڑا جھوٹا ہے۔

بلکہ علامہ ابن عبدالبر کی روایت کے مطابق امام مالکؒ نے کہا۔

ذلک دجال الدجاجلہ ـــ (جامع بیان العلم)

وہ تو دجالوں کا دجال ہے۔

ان تصریحات سے احادیث کی حیثیت واضح ہو گئی ہوگی۔ اور یہ بھی معلوم ہوگیا ہوگا کہ احادیث کی جانچ پڑتال میں اسماء الرجال کا عظیم فن بھی اس قدر قابلِ اعتماد نہیں کہ سے یقینی کہہ کر یہ قرار دیا جائے کہ جو حدیث اس کسوٹی پر پوری اترے وہ بہرحال کھری ہوگی۔ اسماء الرجال کا ذکر ضمناً اس لئے چھڑ گیا کہ اس اعتماد کا پردہ چاک کیا جائے جس پر قانع ہوکر ہمارے زمانہ کے علماء یہ سمجھتے ہیں کہ اسلاف کی سعی و کاوش نے ہمارے لئے کھرا کھوٹا الگ کرکے رکھ دیا ہے۔ آج اگر کسی روایت کو یہ لوگ سلسلۂ زریں کی ایک کڑی قرار دیں تو میں ثابت کرسکتا ہوں کہ اس میں بھی کھوٹ کا احتمال موجود ہے اور خود یہ حضرات بھی اگر غور و فکر سے کام لیں تو اسی نتیجہ پر پہنچیں گے۔

افتراق کی بنیادی وجہ

حدیث کی اس حیثیت کو ذہن میں رکھئے اور پھر اختلاف و افتراق کے اسباب کی طرف رجوع کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ چونکہ حدیث کو بھی کتاب اللہ کے ساتھ دین کی بنیاد تسلیم کیا گیا اور احادیث کی حالت یہ تھی کہ

(ا) ان کی حفاظت کا پورا اہتمام نہ ہوسکا۔

(ب) صحابہؓ کے زمانے میں بھی احادیث میں اختلاف و تناقض موجود تھا۔

(ج) صحابہؓ سے روایت کرنے والوں میں بھی یہ اختلاف منتقل ہوا۔

(د) صحابہؓ نے اپنی فہم کے مطابق اقوالِ رسولؐ کا مفہوم متعین کیا۔ اور ان کے بعد آنے والوں نے بھی یہی

طریقہ اختیار کیا۔

(۲) تدوینِ احادیث کے وقت مدون کرنے والوں نے اپنے ذوق اور اپنی فہم کے مطابق جن احادیث کو صحیح سمجھا انہیں اپنی کتابوں میں جگہ دی۔

(۳) احادیث کی جانچ صحابہؓ کے زمانہ میں قرآن اور درایت سے کی جاتی تھی۔ اب اسماء الرجال کا علم وجود میں آیا مگر وہ بھی نقص و خطا سے مبرا نہیں۔

چونکہ فقہا و مجتہدین نے انہی احادیث کو دین کی بنیاد سمجھا تھا اور احادیث باہم متعارض تھیں اس لئے جب فقہی فرقے وجود میں آئے تو ان کے خیالات و عقائد میں تضاد تھا۔ اور ہر ایک فقہ کی بنیاد حدیث پر تھی۔ اب حدیث کے مختلف درجات مقرر ہوئے لیکن ان درجات پر استناد کرنے میں بھی فقہا مختلف الرائے تھے۔ اس موضوع پر ہم کسی قدر تفصیل سے بحث کریں گے۔

حدیث کے درجات

احادیث میں پہلا درجہ متواتر کا ہے۔ اس بات پر تمام فقہا متفق ہیں کہ متواتر قطعی اور یقینی ہے۔ اس لئے اس کا مرتبہ کتاب اللہ کی طرح ہے۔ اور اس کے احکام کی تعمیل واجب ہے۔ مگر متواتر احادیث کے تعین اور تعداد میں اختلاف ہے۔ بہرحال یہ امر متفق علیہ ہے کہ متواتر قولی احادیث دس سے زائد نہیں۔

متواتر کے بعد مشہور کا درجہ ہے۔ حنفیہ کے نزدیک مشہور تقریباً یقینی چیز ہے۔ اور اسے یہ درجہ دیا جاتا ہے کہ مشہور حدیث سے کتاب اللہ کے احکام منسوخ ہو سکتے ہیں۔ کتاب اللہ کے احکام پر زیادتی ہو سکتی ہے۔ کتاب اللہ کے مطلق حکم کو مشہور حدیث مقید کر سکتی ہے۔ کتاب اللہ کے عام حکم کو مخصوص کر سکتی ہے۔ مشہور کا یہ مرتبہ بھی تقریباً تمام فقہا میں مسلم ہے۔ ہاں خوارج اور بعض معتزلہ نے اس کا انکار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں اس طرح تو حدیث کتاب اللہ پر قاضی ہو گئی۔ حالانکہ صحابہؓ کرام کے زمانے میں ایسا نہ تھا۔ حضرت عائشہؓ نے ابن عمرؓ کی روایت سن کر کتاب اللہ کی تصریح کو نہ منسوخ قرار دیا، نہ مقید، نہ مخصوص۔ بلکہ انہوں نے روایت کو صاف طور پر رد کر دیا۔

زنا کے معاملہ میں شادی شدہ کو سنگسار کرنے کی حدیث کو "مشہور" کا درجہ ملا ہوا ہے۔ لیکن قرآن میں مطلق حکم ہے کہ

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ (زانی اور زانیہ میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارے جائیں) فقہا احادیث کی بنا پر اس حکم کو غیر شادی شدہ سے مقید مانتے ہیں مگر خوارج اور معتزلہ کہتے ہیں کہ اول تو کسی صورت میں جائز نہیں ہو سکتا کہ حدیث سے قرآن کے عام حکم کو مخصوص کیا جائے دوسرے خود قرآن اس بات پر شاہد ہے کہ شادی شدہ اور غیر شادی شدہ دونوں قسم کے لوگوں کو سو کوڑے مارے جائیں۔ کیونکہ سورۃ النساء میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ شادی شدہ لونڈیاں اگر زنا کی مرتکب ہوں تو انہیں شادی شدہ آزاد عورتوں سے نصف سزا دی جائے تو اگر آزاد شادی شدہ عورت کی سزا رجم ہوتی تو رجم کا نصف کیا ہوگا۔ جو لونڈی کے حق میں روا رکھا جائے گا۔ پس ثابت ہوا کہ سورۂ نور والی آیت میں حکم شادی شدہ اور غیر شادی شدہ دونوں کے لئے ہے۔ کیونکہ سو کوڑوں کا نصف تو پچاس کوڑے

ہوسکتے ہیں مگر رجم کا نصف کون معلوم کرے گا۔

بعض صحابہؓ، تابعینؒ اور فقہاؒ سمجھتے ہیں کہ شادی شدہ کو ارتکاب زنا کی سزا میں کوڑے بھی مارے جائیں گے اور رجم بھی کیا جائے گا۔ گویا وہ اس حدیث کو کتاب اللہ کی مقررکردہ سزا پر زیادتی تصور کرتے ہیں۔ احادیث کے درجات پر کلام کرنے کے سلسلے میں ہم نے متواتر و مشہور کو بیان کیا ہے۔ باقی درجات کو حذف کر کے ہم اصل بحث کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ افتراق کا اصل مبنیٰ احادیث سے پھوٹا ہے۔ چونکہ احادیث باہم مختلف ہیں اس لئے مختلف فرقوں نے انہیں قبول کر لیا۔ اور اس طرح مختلف اختلافات رونما ہوئے۔ ہم اجمالاً چند احادیث بیان کریں گے جو باہم مختلف ہیں اور مختلف فرقوں کا ان پر عمل ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے متعہ کو سامنے لایئے۔

متعہ کی احادیث

علامہ زرقانی کہتے ہیں۔

"اوائل اسلام میں متعہ جائز تھا۔ پھر خیبر کے روز حرام ہوا۔ پھر عمرۃ القضا میں درست ہوا پھر فتح مکہ کے روز حرام ہوا۔ پھر جنگ اوطاس میں درست ہوا۔ پھر حرام ہوا۔ پھر تبوک میں درست ہوا۔ پھر حرام ہوا۔ اس طرح بار بار کی حلت اور حرمت سے لوگوں کو شبہ باقی رہا۔ بعض لوگ متعہ کرتے تھے بعض نہیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ آنحضرت صلعم کی وفات ہوئی اور حضرت ابوبکرؓ کی خلافت میں بھی ایسا ہی رہا۔ حضرت عمرؓ کی اوائل خلافت میں بھی یہی حال رہا۔ پھر حضرت عمرؓ نے بر سر منبر اس کی حرمت بیان کی۔ مگر پھر بھی جابرؓ بن عبداللہ، عبداللہ بن مسعودؓ، ابوسعیدؓ، معاویہؓ، اسماءؓ بنت ابوبکرؓ عبداللہؓ بن عباسؓ، عمرو بن حریث اور سلمہؓ بن الاکوع۔ جیسے متعدد صحابہؓ اس کے جواز کے قائل رہے۔"

(ملخص زرقانی۔ شرح موطا)

آج بھی شیعہ حضرات اس کے قائل ہیں۔ رہے جمہور علماء تو اگرچہ وہ اس کی حرمت پر متفق ہیں مگر اس بات پر بھی جمہور متفق ہیں کہ متعہ کرنے والے کو زنا کی حد لازم نہیں آتی۔ رہا حضرت عمرؓ کا یہ قول کہ "اگر میں پہلے سے منع کر چکا ہوتا تو متعہ کرنے والے کو سنگسار کر دیتا۔" تو کہا جاتا ہے کہ یہ محض ڈرانے کے لئے انہوں نے ارشاد فرمایا تھا۔ دیکھئے روایات کے باہمی اختلافات نے کس قدر گھپلا ڈال دیا۔ اگر قرآن کو روایات کی تشریح سے بلند ہو کر پڑھئے تو کسی آیت سے متعہ کے جواز کا مفہوم نہیں نکل سکتا بلکہ اس کی حرمت پر نصوص صریح شاہد ہیں۔ مگر ہمارے ہاں مصیبت یہ ہے کہ کسی روایت کو ذہن میں جما کر قرآن حکیم کی تشریح اس کے مطابق کی جاتی ہے۔

قرشیت شرط ہے

اسی طرح اس مسئلہ کو لیجئے کہ خلافت کے لئے قرشیت شرط ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن حکیم نے شعوب قبائل کو باہمی فضیلت کی وجہ نہیں قرار دیا۔ بلکہ محض تعارف کی وجہ قرار دیا ہے۔ اور قرآن کے نزدیک قابل تکریم اور واجب التکلیم وہی ہے جو زیادہ متقی ہے۔ مگر آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ جمہور اہل سنت کے نزدیک خلیفہ کا قریشی ہونا واجب ہے اس لئے

کہ ایک حدیث بیان کی جاتی ہے۔

الائمہ من قریش ۔ (امام قریش میں سے ہوں)

حافظ ابن حجر عسقلانی کہتے ہیں کہ چالیس صحابیوں سے یہ روایت وارد ہوئی ہے مگر قرآن اور درایت کو معیار تسلیم کیا جاتا تو دونوں اس کی تائید نہیں کرتے۔ مگر حدیث تو قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے۔ مطلق کو مقید کر سکتی ہے۔ عام کو خاص کر سکتی ہے اور کتاب اللہ پر زیادتی بھی کر سکتی ہے۔ اس لئے یہ امر آج تک متفق علیہ چلا آتا ہے کہ خلیفہ کے لئے قریشی ہونا ضروری ہے۔ بعض لوگوں نے مندرجہ بالا حدیث کو امر نہیں بلکہ خبر قرار دیا ہے۔ مگر اس قابل نہیں کہ انہیں اہمیت دی جاسکے کیونکہ وہ عربی زبان کی ابجدی حرف و نحو بھی کورے معلوم ہوتے ہیں۔ بہرحال لمبے ساری دنیائے اسلام، سوائے خوارج اور معتزلہ کے آج تک ایک ضروری شرط تسلیم کرتی آئی ہے۔ عضد الدولہ، محمود غزنوی، اور ملک شاہ سلجوقی جیسے عظیم الشان بادشاہ بھی بغداد کے کمزور قریشی خلیفوں سے خطاب حاصل کرتے تھے۔ اور ان پر فخر کرتے تھے اس لئے کہ خود یہ لوگ قریشی نہ تھے اور کوئی بھی انہیں خلیفہ ماننے کو تیار نہ تھا۔ مصر میں جب فاطمیہ خاندان نے قوت پکڑی اور وسیع سلطنت قائم کرلی تو عباسیوں نے ایک محضر تیار کرایا جس میں فاطمیہ کے نسب کا انکار تھا۔ اس پر علماء سے دستخط کرائے گئے اور لوگ فاطمیہ سے برگشتہ ہو گئے۔

غرضیکہ ایک طرف یہ روایت ہے اور دوسری طرف یہ روایات ہیں۔ کہ اگر تم پر ایک حبشی بھی خلیفہ مقرر ہو۔ جس کا سر کشمش کے دانے کی طرح ہو تب بھی تم پر اس کی اطاعت فرض ہے۔"

دیگر مثالیں

ان باہمی متناقض روایات کو دیکھئے اور پھر سوچئے کہ یہ اختلافات امت پر کس طرح اثر انداز ہو رہے ہیں۔ ایک مسئلہ ہے کہ اگر باپ کوئی چیز اپنے بیٹے کو ہبہ کر دے تو وہ اس سے رجوع کر سکتا ہے یا نہیں کر سکتا۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ بیٹے کے حق میں ہبہ کرنے سے وہ رجوع نہیں کر سکتا۔ وہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ سمرہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ:

اذا کانت هبة لذی رحم محرم لم یرجع۔

اگر ذی رحم محرم کے حق میں ہبہ کیا جائے تو رجوع نہ کیا جائے۔

لیکن مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ باپ رجوع کر سکتا ہے۔ ان کی دلیل ابن عباس کی یہ حدیث ہے۔

قال صلعم لا یحل لرجل ان یرجع فی العطیۃ الا الوالد فیما

یعطی ولدہ (خمسۃ)

کسی شخص کیلئے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے عطیہ کو واپس کرے مگر باپ اپنے بیٹے کو جو عطیہ دے وہ اسے واپس کر سکتا ہے۔

مہر کی مقدار کا مسئلہ بھی اسی طرح مختلف فیہ ہے۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ دس درہم سے کم مہر نہیں ہو سکتا۔ ان کی دلیل جابر کی یہ حدیث ہے

قال صلعم لا تنکحوا النساء الا الاکفاء ولا یزوجھن الا الاولیاء ولا مھر دون عشرۃ دراھم۔

نبی صلعم نے فرمایا بغیر کفو کے عورتوں سے نکاح نہ کرو۔ بغیر ولی کے ان سے نکاح نہ کرو اور دس درہم سے کم مہر نہ باندھو۔

شافعیہ اور حنابلہ اس کے مخالف ہیں۔ وہ بھی جابر ہی کی اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔

لو ان رجلا اعطی امراۃ صداقا ملٔ یدیہ طعاما کانت لہ حلالا (احمد ۔ ابوداؤد ۔)

اگر کوئی مرد عورت کو مہر میں دو لپ بھر طعام دے تو وہ اس کے لئے حلال ہو جاتی ہے۔

مہر کی مقدار معین کرنا کوئی ایسا ضروری کام نہیں۔ قرآن نے اسے مطلق چھوڑا ہے۔ اس لئے اسے مطلق رہنے دیا جاتا تو اختلافات پیدا نہ ہوتے۔ مگر جب اسے مقید کرنے کی کوشش کی گئی تو لازماً اختلاف پیدا ہونا تھا۔ پھر یہ اچوبہ بھی دیکھئے کہ دو متناقض روایات کا راوی ایک ہی ہے۔

کرنے کا کام

ہم نے محض نمونے کے طور پر چند مختلف احادیث لی ہیں جن سے مختلف فرقے وجود میں آئے ہیں۔ ورنہ تفصیل مقصود ہو تو سینکڑوں ایسی احادیث مل جائیں گی جو باہم متناقض ہیں۔ یہ تناقض اور اختلاف عبادات سے زیادہ معاملات میں ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اگر اللہ نے حدیث پر عمل نہ کرنے پر گرفت شروع کر دی تو یہ تکلیف مالایطاق ہو گی کیونکہ اگر یہ ایسی ہی ضروری چیز تھی تو خدا نے کیوں نہ اسے قرآن کی طرح محفوظ کر دیا؟ آج ان مختلف روایات کو دیکھ کر ہم کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ فلاں روایت غلط ہے اور فلاں صحیح۔ آج اگر اختلافات کو ختم کرنا ہے تو ہمیں دین کی بنیاد اس کتاب کو قرار دینا ہو گا جو اللہ نے نقص و خطا سے پاک رکھی ہے۔ باطل کی آمیزش جس میں قیامت تک نہیں ہو سکتی اور جس کا یہ دعوےٰ ہے کہ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِندِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا۔ (اگر یہ کتاب اللہ کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتی تو اس میں بہت سے اختلافات پاتے۔)

قرآن کو بنیاد بنا کر احادیث کو اس کے تابع رکھیے تو بچھڑے ہوئے مل سکتے ہیں اور ٹوٹے ہوئے رشتے جڑ سکتے ہیں۔ اگر احادیث کو اس پر قاضی بنایئے تو قرآنی اختلافات اسی طرح جاری رہے گا۔ امت واحدہ کی حرمت فرقوں میں بٹ کر بیگانوں پر کچھ اچھالی رہے گی اور شجرہ ملیہ ... الیاں نچتے رہئے۔ (اللہ ہمیں اس سے محفوظ رکھے)[1]

---

[1] مصنف کی اصل کتاب ۲۰۵ صفحات کی ہے جس میں بڑی تفصیل سے موضوع زیر نظر پر روشنی ڈالی گئی ہے مگر ہم نے اپنے طور پر اس کی تلخیص کی کوشش کی ہے۔ اس تلخیص میں بھی اصل الفاظ مصنف کے ہیں۔ میں نے صرف ترجمہ کیا ہے۔ (مترجم)

مجلسِ اقبالؒ

(مثنوی ۔ پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق)

(مُسَلسَل ۔ ۳)

قسطِ دوم میں اس مثنوی کی تمہید سامنے آچکی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ مومن کی زندگی یہ ہے کہ وہ اپنی ہستی کو مستحکم اور منفرد رکھے اور دوسروں کے لئے کشود کار اور کشادِ ذات کا موجب بنے۔ اب اس سے اگلا باب ہمارے سامنے آتا ہے جس کا عنوان ہے ـــــ **خطاب بہ مہرِ عالمتاب**

اقبالؒ جہاں عقل و عشق۔ ذکر و فکر۔ خرد و نظر وغیرہ کا تقابل کرتا ہے وہاں شرق و غرب کو بھی ایک دوسرے کے سامنے لاتا ہے۔ اس سے اس کی مراد دو ممالک کا باہمی مقابلہ نہیں بلکہ زندگی کے دو متضاد نظریات و تصورات کا تقابل ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جیسا کہ قرآن کریم نے بتایا ہے، دنیا کی ہر قوم کی طرف خدا کے پیغامبر آئے ہیں لیکن تاریخ نے جن بڑے بڑے مذاہب کا ذکر کیا ہے ان کا آغاز مشرق میں ہوا ہے۔ اور مغرب اپنی جس تہذیب کی رُو سے دنیا میں متعارف و ممتاز ہوا ہے اس کی بنیاد وحی کے برعکس، مادیت پر ہے۔ اس لئے اقبال جب شرق و غرب کا مقابلہ کرتا ہے تو اس کے پیش نظر، وحی اور عقلِ بیباک" (مغرب کی مادیت) کا تقابل ہوتا ہے۔ اسی جہت سے وہ مہرِ عالمتاب کو "امیرِ خاور" (مشرق کا سردار) کہہ کر پکارتا ہے۔ اور اس سے ملتجی ہے کہ وہ صفحۂ ارض کو اپنی ضیا پاشیوں سے معمور کرے۔ اس باب میں جو کچھ مہرِ عالمتاب سے کہا گیا ہے اسے وحی کی روشنی سے متعلق سمجھنا چاہیئے۔ پہلا شعر ہے ؎

اے امیرِ خاور اے مہرِ منیر   می کنی ہر ذرہ را روشن ضمیر

اے سردار مشرق! اے آفتاب عالمتاب! تو ہر ذرہ کے ضمیر کو روشنی عطا کرتا ہے۔ ہر پیکر خاکی (انسان) تجھ سے بالیدگی حاصل کرتا ہے۔

از تو ایں سوز و سرور اندر وجود　　　　از تو ہر پوشیدہ را ذوقِ نمود

ہر انسان کے دل میں زندگی کی حرارت تیری وجہ سے ہے۔ ہر ایک کی مُضمر صلاحیتوں کی نشو و نما تیری رہینِ منت ہے (غور کیجئے۔ وحی کی، سورج کے ساتھ تشبیہ، کس قدر تام ہے)۔

می رود روشن تر از دستِ کلیم　　　　زورقِ زرینِ تو در جوئے سیم

اس فضائے نیلگوں میں تو اس طرح محو خرام رہتا ہے جس طرح چاندی کی ندی میں، سونے کی کشتی بہے چلی جارہی ہو ایسی کشتی جس کی درخشندگی، جناب کلیم اللہ کے یدِ بیضا سے بھی زیادہ تابناک ہے۔ (یہاں اشارہ قرآن کریم کی طرف ہے۔ اسی وجہ سے اس کی روشنی کو یدِ بیضا سے بھی زیادہ تابناک کہا گیا ہے۔)

پرتو تو ماہ را مہتاب داد　　　　لعل را اندر دلِ سنگ آب داد

چاند پر تیرا عکس پڑتا ہے تو وہ مہتاب بن جاتا ہے۔ دوسری طرف پتھر کا ٹکڑا، جب تیری حرارت کو اپنے اندر مرتکز کرتا ہے تو لعلِ درخشندہ ہو جاتا ہے۔

اگر آپ اس تیرہ سو سال کی تاریخ کا صحیح نظروں سے مطالعہ کریں تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ دنیا میں جہاں جہاں شرفِ انسانیت کی کوئی کرن، اور زندگی کی حرارت کی کوئی رمق نظر آتی ہے، وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ، قرآنی تعلیم ہی کا پرتو ہے۔ اسی حقیقت کو اقبالؒ نے دوسرے مقام پر ان بلند اور حسین ترین الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو　　　　زانکہ از خاکش بروید آرزو

یا ز نورِ مصطفےؐ او را بہاست　　　　یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفےؐ است

اس سے اگلے دو شعروں میں بھی آفتاب کی اسی خصوصیت کی مزید وضاحت کی گئی ہے کہ کائنات کی ہر شے میں نور و حرارت، اسی کے فیضان کا اثر ہے۔

لالہ را سوزِ دروں از فیضِ تست　　　　در رگِ او موجِ خوں از فیضِ تست

گلِ لالہ کا "شعلۂ پنہاں" اور اس کے خون کی رنگینی" تیرے ہی فیض سے ہے۔ (یوں تو ہماری شاعری میں — بلکہ اور ممالک کی شاعری میں بھی — لالہ کو شعلہ صفت قرار دیا گیا ہے، لیکن اقبالؒ کے ہاں اس کا ذکر بڑی کثرت سے آتا ہے۔ وہ عشق کے سوزِ دروں اور زندگی کی حرارت کو بالعموم لالہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

نرگساں صد پردہ را برمی درد　　　　تا نصیبے از شعاعِ تو برد

لالہ اگر جلال کا مظہر ہے تو شاعری میں نرگس پیکرِ جمال ہے۔ اس سے اگر سوز و حرارت کی تعبیر کی جاتی ہے تو اس سے نور و بصیرت کی تفسیر۔ لالہ اپنا سینہ شق کر کے آفتاب کی حرارت اپنے اندر جذب کر لیتا ہے، تو نرگس ہزاروں پردے چاک کر کے اس کی روشنی کو اپنے لئے سرمۂ چشم بنا لیتی ہے۔ دنیا میں علم کا نور اور عمل کی حرارت، سب وحی کے فیض سے ہے۔

آفتابِ عالمتاب کی ان خصوصیات کو بیان کرنے کے بعد، علامہ اس کا استقبال ان الفاظ سے کرتے ہیں کہ

خوش بیا! صبحِ مراد آوردۂ هر شجر را نخلِ سینا کردۂ

تم آؤ۔ میرا دیدہ و دل تمہارے لئے فرشِ راہ ہے۔ تمہارے جلو میں مرادیں بھری صبح عروسانہ شان سے آتی ہے۔ تمہارے نور سے اس چمن کا ہر درخت، شجرِ طور بن جاتا ہے جو تجلیاتِ خداوندی کا مظہر ہوتا ہے۔ ذرا غور کیجئے۔ جب ایک شخص قرآن کی تلاوت کرتا ہے تو اس وقت گویا خدا اس سے ہمکلام ہوتا ہے۔ اس لئے کہ قرآن، خدا کا کلام ہے۔ اور جس سینے میں قرآن کی تعلیم اُتر جاتی ہے، وہ تجلیاتِ خداوندی سے معمور ہو جاتا ہے۔ یاد رکھئے! اب خدا سے "ہمکلام" ہونے اور اس کی تجلیات کا نظارہ کرنے سے مراد اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسان خدا کی کتاب (قرآن) پر غور کرے اور اس کے مطابق عمل کرے۔

اس کے بعد اقبال؟، وحی کے حضور اپنی عرضداشت پیش کرتا ہے ــــ اور دیکھئے کہ کس حسن و خوبی سے پیش کرتا ہے۔

تو فروغِ صبح و من پایانِ روز در ضمیرم من چراغے برفروز

تو تمام دنیا سے تاریکیاں دور کر کے، اسے بقعۂ نور بنا دیتا ہے۔ اور میری زندگی شام کی تاریکی سے مشابہ ہے۔ میری التجا یہ ہے کہ تو میرے قلب میں ایسا چراغ روشن کر دے جس سے یہ زندگی سراپا نور بن جائے۔

تیرہ خاکم را سراپا نور کن در تجلی ہائے خود مستور کن

اس طرح سراپا نور بن جائے کہ میں تیری تجلیات کے اندر مستور ہو جاؤں۔ یہ مجھے چاروں طرف سے گھیر لیں۔

تا برون آرم شبِ افکارِ شرق برفروزم سینۂ احرارِ شرق

تاکہ میں اہلِ مشرق کے تصورات، نظریات، خیالات، عقائد و افکار کو جو اس وقت یکسر تاریک ہیں روشن کر سکوں، اور جو لوگ آزاد زندگی بسر کرنے کے آرزومند ہیں ان کے سینے کو اس روشنی سے تابناک بنا سکوں۔

از نوائے پختہ سازم خام را گردشِ دیگر دہم ایام را

میں اپنی آواز سے، ان کے خام خیالات میں پختگی پیدا کرتا جاؤں۔ اور اس طرح تاریخ میں ایک ایسا انقلاب برپا کر دوں، جس کا چشمِ فلک کو صدیوں سے انتظار ہے۔ یعنی یہاں صحیح قرآنی معاشرہ متشکل ہو جائے۔

فکرِ مشرق آزاد گردد از فرنگ — از سرودِ من بگیرد آب و رنگ

اس وقت کیفیت یہ ہے کہ اہلِ مشرق یورپ کے مادہ پرستانہ افکار و تصورات کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ سب سے پہلا کرنے کا کام یہ ہے کہ انہیں اس غلامی سے آزاد کیا جائے ـــ یہ حصہ لا ہو گا۔ یعنی ذہن کو غیر قرآنی تصورات سے پاک کرنا۔ اس کے بعد وہ میرے پیغامات سے' جنہیں میں قرآن سے اخذ کرتا ہوں' نیا آب و رنگ حاصل کریں گے۔ یہ الّا کی منزل ہو گی۔ جب تک یہ نہیں ہو گا' مشرق صحیح آزادی حاصل نہیں کر سکے گا اس لئے کہ

زندگی از گرمیٔ ذکر است و بس — حریت از عفتِ فکر است و بس

آزادی اس کا نام نہیں کہ قوم اپنی حکومت آپ قائم کرے۔ اس کی مملکت خود مختار ہو۔ صحیح آزادی یہ ہے کہ اس قوم کا ذہن غیروں کے افکار و تخیلات سے پاک ہو۔ اصل زنجیریں جن کے توڑنے کا نام آزادی ہے' وہ ہوتی ہیں جن میں کسی قوم کا ذہن مقید ہوتا ہے۔ جب تک وہ نہیں ٹوٹتیں' قوم آزاد نہیں ہو سکتی۔ یہ پہلا مرحلہ ہے۔ اس کے بعد' اگلا مرحلہ یہ ہے کہ وحی کی روشنی میں' اس قوم کے قوائے عملیہ میں حرارت تو پیدا کی جائے ـــ قوموں کی آزادی کے لئے تطہیرِ فکر اور گرمیٔ ذکر دونوں از بس ضروری ہیں۔

چوں شود اندیشۂ قومے خراب — ناسرہ گردد بدستش سیم ناب

اگر کسی قوم کے افکار و تخیلات۔ عقائد و نظریات خراب ہو جائیں تو اس کے ہاتھوں میں خالص چاندی بھی کھوٹا سکہ بن جاتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ قوموں کی زندگی کے لئے سامانِ زیست کے ذرائع لاینفک ہیں۔ جس قوم کی معاشی حالت درست نہیں وہ زندہ نہیں رہ سکتی۔ لیکن معاشی حالت بھی اسی صورت میں درست ہو سکتی ہے جب اس قوم کے نظریاتِ زندگی صحیح ہوں۔ اگر اس کا ذہن غلام ہے' تو اس کے ذرائع پیداوار بھی اسے خوشحالی اور فارغ البالی عطا نہیں کر سکتے۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کے پیشِ نظر اقبالؒ نے کہا تھا کہ

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

اس کا زوال' ان غلط معتقدات اور غیر قرآنی تصورات کی وجہ سے ہے جو صدیوں سے اس کے قلب و دماغ کو تاریکیوں میں رکھے ہوئے ہیں۔ جب کوئی قوم اس قسم کے غلط خیالات کی حامل بن جائے تو

میرد اندر سینہ اش قلبِ سلیم — در نگاہِ او کج آید مستقیم

اس میں اس امر کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی کہ وہ زندگی کی مستقل اقدار کے سامنے سرِ تسلیم خم کرے۔ اس کے برعکس اس کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ ہر ٹیڑھی چیز اسے سیدھی نظر آتی ہے۔ ہر عیب اس کی نگاہ میں ہنر بن جاتا ہے۔ ہر برائی اسے بھلائی

بن کر دکھائی دیتی ہے۔ رفتہ رفتہ اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ

برکراں از حرب و ضرب کائنات چشم او اندر سکون بیند حیات

دوسری قومیں کارزارِ حیات میں سرگرم عمل ہوتی ہیں اور یہ گہری نیند میں سو رہی ہوتی ہے۔ وہ دریا کی تلاطم خیزیوں میں برد آزما ہوتی ہیں اور یہ لبِ ساحل محوِ تماشا ہوتی ہے۔ عمل کا تصور اسے موت بن کر ڈراتا ہے۔ یہ بے عملی کی ساکت صامت زندگی ہی کو عین حیات سمجھتی ہے۔

نتیجہ اس کا یہ کہ

موج از دریاش کم گردد بلند گوہر او چوں خزف تا ارجمند

اس کی زندگی میں قوت اور حرارت کی کوئی نمود نہیں ہوتی۔ اس کے دریائے ہستی سے کوئی موج اٹھتی دکھائی نہیں دیتی۔ وہ دریا کیا، ایک جوہڑ ہوتا ہے۔ جس میں عدم حرکت سے کچھ عرصے کے بعد سخت تعفن پیدا ہو جاتا ہے۔ قوموں کے بازارِ بیع و شرا میں اس کی بے وقعتی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اگر وہ اپنے ہاں کا کوئی موتی بھی پیش کرے تو کوئی اسے کوڑیوں کے دام بھی نہیں خریدتا۔ اس منڈی میں اس جنسِ کاسد کو کوئی پوچھتا تک نہیں۔

حضرت علامہؒ نے یہ مثنوی تشکیلِ پاکستان سے دس بارہ سال قبل لکھی تھی۔ اس وقت انہوں نے پاکستان کا تصور تو پیش کر دیا تھا لیکن اس کا عملی امکان کہیں نظر نہیں آتا تھا ——— اگرچہ ان کی نگہِ دور بیں نے "ہندی مسلمان" کو ایک "بہشتے فی سبیل اللہ" کا پیغام دے دیا تھا ——— ان کی وفات کے قریب نو سال بعد، پاکستان وجود میں آیا۔ اور اسے وجود میں آئے اب پندرہ سال کا عرصہ ہو گیا۔ حضرت علامہؒ نے جو کچھ اس مثنوی میں کہا ہے یوں نظر آتا ہے جیسے انہوں نے پاکستان کی زندگی کا پورا پورا مطالعہ کر کے سارا نقشہ ہمارے سامنے کھینچ کر رکھ دیا ہے۔

قرآن پر تدبر، انسان کو اس قسم کی بصیرت عطا کر دیتا ہے۔ جس سے وہ یہ کہنے کے قابل ہو جاتا ہے کہ

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے

سوال یہ ہے کہ جب کوئی قوم ایسے حالات میں گھر جائے تو اسے کیا کرنا چاہیئے۔ اس کے لئے حضرت علامہؒ پورا پروگرام ایک شعر میں مرتب کر دیتے ہیں جب کہتے ہیں کہ

پس نخستیں بایدش تطہیرِ فکر بعد ازاں آساں شود تعمیرِ فکر

اس قوم کو چاہیئے کہ سب سے پہلے اپنے خیالات۔ نظریات۔ تصورات۔ معتقدات۔ کو غیر قرآنی آمیزش سے پاک کرے۔ یعنی لا الٰہ پر پورا پورا عمل کرے۔ جب وہ کعبۂ فکر و نظر کو باطل کے بتوں سے پاک کرے گی تو پھر اس میں صحیح قرآنی فکر

پیدا کرنا آسان ہوگا۔ اگر پہلے قلب و نظر کی تطہیر نہیں کی جائے گی تو ان کی کوئی تعمیری کوشش نتیجہ خیز نہیں ہوگی ۔ قوموں کی یہ تطہیرِ فکر صحیح تعلیم سے ہوتی ہے۔ تشکیل پاکستان کے بعد، ہم نے سب سے پہلے اس بات پر زور دیا تھا کہ ہم اپنی آنے والی نسلوں کی تعلیم قرآنی انداز کے مطابق کریں۔ اس پر کسی نے توجہ نہ دی۔ ہم اپنی پکار کو برابر دہراتے رہے، لیکن قوم نے اس کا کوئی خیال نہ کیا۔ اس کا جو نتیجہ ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔

اس کے بعد بھی ہماری حالت کبھی سنبھل نہیں سکے گی، جب تک ہم اپنی فکر کو غیر قرآنی تصورات سے آزاد نہیں کرینگے ان غیر قرآنی تصورات میں مغرب کے افکارِ باطل بھی شامل ہیں، اور ہمارے وہ مروجہ غلط معتقدات بھی جنہوں نے بدقسمتی سے اسلام کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ اس کے سوا ہمارے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔

پس نخستیں بایدش تطہیرِ فکر
بعد ازاں آساں شود تعمیرِ فکر

یہ اس باب کا آخری شعر ہے۔

نمایندگان بزمہائے طلوعِ اسلام کی توجہ کے لئے۔

مختلف بزموں کے ذمے میزان پبلیکیشنز کی کتب کے سلسلے میں جو رقوم واجب الادا ہیں۔ ان کی جلد از جلد ادائیگی اشد ضروری ہے۔ وہ کتب جو پہلی سی اچھی حالت میں ہوں میزان کو واپس کی جاسکتی ہیں۔

میزان پبلیکیشنز، ۲ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ لاہور

سوالات ـــ اور ان کے ـــ جوابات

میں گزشتہ ماہ (نومبر میں) کراچی گیا۔ وہاں بہت سے اجتماعات سے خطاب کیا۔ خطاب کے بعد سامعین کے استفسارات کے جوابات بھی دیے گئے۔ ان استفسارات میں بعض ایسے تھے جو اس موضوع سے متعلق نہیں تھے جس پر خطاب ہوا۔ (اور چونکہ یہ کہہ دیا گیا تھا کہ اس وقت جواب صرف ان سوالات کا دیا جائے گا جو موضوع سے متعلق ہوں، اس لئے) ان سوالات کا وہاں جواب نہ دیا گیا۔ نیز بعض سوالات کا جواب وقت کی کمی کی وجہ سے نہ دیا جا سکا۔ میں نے سامعین سے وعدہ کیا تھا کہ ان سوالات کے جواب بذریعہ طلوعِ اسلام دے دیئے جائیں گے۔ اس لئے وہ سوالات اور ان کے مختصر جواب درج ذیل ہیں۔ (پرویز)

غلام اور لونڈیاں

۱۔ **سوال** ۔ آپ نے کہا ہے کہ اسلام احترامِ آدمیت سکھاتا ہے پھر یہ زرخرید باندیوں اور دشمن کی قیدی عورتوں کو لونڈیاں بنانے کی اجازت کیسے دیتا ہے؟

جواب ۔ اسلام نہ زرخرید باندیوں کی اجازت دیتا ہے، نہ دشمن کی قیدی عورتوں کو لونڈیاں بنانے کی۔ دشمن کے قیدیوں کے متعلق اس نے بالفاظ صریح کہہ دیا کہ انہیں یا تو فدیہ لے کر چھوڑنا ہوگا یا احساناً۔ باقی رہا کسی انسان (مرد یا عورت) کو بھیڑ بکری کی طرح خرید نا (اور اس طرح اس مرد کو غلام اور عورت کو باندی بنا لینا) تو اس تصور سے اسلام کی روح کانپتی ہے۔ قرآن کریم میں غلاموں اور لونڈیوں کے متعلق جو احکام ہیں وہ ان کے متعلق ہیں جو ظہورِ اسلام کے وقت عربوں کے معاشرے میں موجود تھے۔ قرآن نے آہستہ آہستہ انہیں یا تو رہا کرا دیا یا جزوِ خاندان بنا دیا۔ اور آئندہ کے لئے غلامی کا دروازہ بند کر دیا۔

۲۔ **سوال** ۔ لونڈیاں اور باندیاں خلفائے عباسیہ اور اُمیہ رکھتے تھے اس کے متعلق کیا خیال ہے؟

جواب۔ وہ خلفائے عباسیہ یا اُمیہ کا ذاتی فعل تھا جس کا ذمہ دار اسلام نہیں۔ ان کا کوئی قول یا عمل، اسلام میں سند نہیں ہو سکتا۔ آپ تو، اُن کے ہاں کے غلاموں اور لونڈیوں کی بابت دریافت فرماتے ہیں۔ ان کا بہرے سے بادشاہت کو وراثہ میں لینا کون سا اسلامی عمل تھا؟

۳۔ سوال۔ قرآن کا حکم ہے کہ جنگی قیدیوں کو فدیہ لے کر یا احسان کے طور پر چھوڑ دیا جائے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب کسی قوم کو معلوم ہو کہ مسلمانوں نے ان کے قیدیوں کو بغیر کچھ لئے چھوڑ دینا ہے، تو وہ فدیہ کیوں دیں گے؟

جواب۔ جنگ میں اول تو بالعموم ہوتا یہ ہے کہ کچھ ہمارے لوگ دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہو جاتے ہیں، کچھ ان کے لوگ ہمارے ہاں قید ہوتے ہیں۔ اس صورت میں قیدیوں کا تبادلہ خود ان کا فدیہ بن جاتا ہے۔ ایسی صورت نہ بھی ہو تو بھی کوئی قوم، صلح ہو جانے کے بعد یہ نہیں چاہتی کہ ان کے افرادِ قوم دوسروں کی قید میں رہیں، وہ انہیں ضرور چھڑا لیتی ہے۔ لیکن اگر بفرضِ محال ایسی صورت پیدا نہ ہو اور ہمیں ان قیدیوں کو بغیر کچھ لئے چھوڑ دینا پڑے تو اس کے نتائج جس قدر خوشگوار نکل سکتے ہیں، اس کا ہم اندازہ نہیں کر سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ چونکہ آج ساری دنیا پر کاروباری ذہنیت چھا گئی ہے اس لئے ہم احسان کی قدر و قیمت اور اس کے انسانیت ساز نتائج سے لذت آشنا ہی نہیں ہے۔ بیع و شریٰ کی اس منڈی میں جہاں ہر شے روپے سے تولی جاتی ہے، انسانیت کی بلند اقدار کی کوئی قیمت محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن یاد رکھیئے! یہ اقدار اپنی مستقل قیمت رکھتی ہیں۔ اس گئے گزرے زمانے میں بھی جہاں کہیں اس قسم کی کسی قدر کی نمود ہوتی ہے، اس کے سامنے آنے سے روح میں بیساختہ شگفتگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس قسم کا واقعہ کہ ایک شخص نے اپنا سب کچھ خرچ کر کے، ایک بیوہ کے دو مریض بچوں کی جان بچائی، "کاروباری" دنیا میں حماقت سے تعبیر کیا جائے گا، لیکن دنیائے انسانیت میں آج بھی اس کا ذکر تحسین و تبریک کے ساتھ ہو گا۔ قرآن، بلند انسانی اقدار کا وزن کاروباری میزان میں نہیں کرتا۔ اس کے لئے اس کے اپنے پیمانے ہیں۔ احسان اسی قسم کی قدر ہے۔

۴۔ سوال۔ ہمیں تو آج بھی یہ بتایا جاتا ہے کہ اگر ہندوستان کے ساتھ ہماری جنگ ہوئی تو ہم ان کی قیدی عورتوں کو لونڈیاں بنائیں گے۔ اور ہمارا یہ عمل عین اسلام کے مطابق ہو گا؟

جواب۔ اسلام کو بدنام کرنے والے ہر زمانے میں موجود رہتے ہیں۔

۵۔ سوال۔ کیا پاکستان کی سرزمین کا تحفظ اسلامی فریضہ ہے؟

پاکستان کا تحفظ

جواب۔ پاکستان اس مقصد کے لئے حاصل کیا گیا ہے کہ یہاں دینِ خداوندی کے مطابق معاشرہ متشکل ہو۔ یہ خطۂ زمین اس بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اس مقصد کے لئے جس طرح اس خطۂ زمین کا حاصل کرنا ضروری تھا، اسی طرح اس کا تحفظ بھی ضروری ہے۔ اگر (خدانکردہ) یہ خطۂ زمین ہی نہ رہا تو دینِ خداوندی کے قیام کا امکان

بھی باقی نہ رہے گا۔ اس مقصد کے پیشِ نظر اس خطۂ زمین کی حفاظت اسلامی فریضہ ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی اسلامی فریضہ ہے کہ یہاں دینِ خداوندی کے مطابق نظام قائم کرنے کے لئے آئینی طور پر امکانی کوشش کی جائے۔

۶۔ سوال۔ فی زمانہ پاکستان میں ہم کو قرآن کے دیئے ہوئے بنیادی حقوق حاصل ہیں یا نہیں، اگر نہیں تو ان کے

بنیادی حقوق حصول کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔

جواب۔ قرآن کے دیئے ہوئے حقوق، قرآنی نظام میں حاصل ہوتے ہیں، اور یہ ظاہر ہے کہ سرِدست پاکستان میں قرآنی نظام رائج نہیں۔ اس نظام کے قیام کے لئے ہمیں آئینی جدوجہد کرنی چاہیئے۔ جمہوری آئین کے مطابق اس کا طریقہ یہ ہے کہ قرآنی نظام کے تصور کو عام کیا جائے۔ جس قدر یہ تصور عام ہوتا جائے گا اس کے قیام کے لئے فضا سازگار ہوتی جائیگی۔

۷۔ سوال۔ ایک اجتماع میں میں نے، ایک سوال کے جواب میں، جب یہ کہا کہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ قرآنی تصور کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے تو اس پر ایک صاحب کی طرف سے یہ سوال آیا کہ آج کل کسی تصور کے عام کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ پریس کے ذریعہ اس تصور کو عام کیا جائے۔ یا پبلک جلسوں میں اس کا چرچا کیا جائے۔ لیکن ہمارے ہاں آج کل حالت یہ ہے کہ ایک خاص پارٹی نے جو حکومت کی کرسیوں پر قابض ہونا چاہتی ہے پریس کو اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے، جس کی وجہ سے اس پارٹی کے خیالات کے خلاف کسی کی طرف سے ایک لفظ بھی اخبارات میں چھپ نہیں سکتا اور اس کے ہم خیال لوگ کسی دوسرے کو تقریر تک بھی نہیں کرنے دیتے۔ ان حالات میں اس تصور کو عام کس طرح کیا جا سکتا ہے؟

جواب۔ یہ درست ہے۔ دین کے صحیح تصور کے خلاف، مفاد پرست گروہوں کی طرف سے ہمیشہ مخالفت ہوتی رہی ہے۔ اور آج بھی اس کی مخالفت ہو رہی ہے۔ لیکن اس تصور کے حامیوں کو سکون اور استقامت سے کام لینا، اور جو ذرائع انہیں میسر آسکیں انہی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا ہوگا۔ یہ پیغام لوگوں تک انفرادی طور پر بھی تو پہنچایا جا سکتا ہے۔ یاد رکھیئے! غیر قرآنی نظام، دھاندلی سے بھی قائم کیا جا سکتا ہے لیکن قرآنی نظام کے قیام میں دھاندلی کام نہیں دے سکتی۔ یہ اس کی روح کے خلاف ہے۔

۸۔ سوال۔ موروثی ملوکیت اسلام کی اصل و بنیاد کے خلاف ہے۔ امام حسینؓ نے اس کے خلاف آواز اٹھائی اور رتبۂ شہادت حاصل کیا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے بعد، ان تیرہ سو سال میں مسلمانوں میں ہر جگہ اسی قسم کی موروثی حکومت قائم رہی لیکن کسی نے اس کے خلاف آواز نہ اٹھائی حالانکہ چوٹی کے اسلاف

موروثی ملوکیت میں بڑے بڑے علمائے دین گزرے ہیں۔

جواب۔ اُن لوگوں نے موروثی حکومت کے خلاف کیوں آواز نہ اٹھائی، اس کا جواب ہمارے ذمے نہیں۔ ماضی میں گزرے ہوئے لوگوں کے متعلق قرآن کریم کی تعلیم بڑی صاف اور واضح ہے۔ اس کا ارشاد ہے کہ تِلْكَ أُمَّةٌ

قَدْ خَلَتْ ۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۔ وَلَا تُسْئَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۲/۱۴۱)
یہ لوگ گزر چکے ہیں۔ انہوں نے جو کچھ کیا اس کا بدلہ ان کے لئے ہے۔ تم جو کچھ کرو گے اس کا نتیجہ تمہارے لئے ہوگا۔ تم سے یہ قطعاً نہیں پوچھا جائے گا کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔ (تم سے یہ پوچھا جائے گا کہ تم نے کیا کیا تھا)۔

لیکن حیرت ہے کہ آپ کی نگاہ گزرے ہوئے زمانے کے علمائے دین کی طرف گئی ہے۔ خود اپنے زمانے کے ان علماء کی طرف کیوں نہیں اٹھی جن کی کیفیت یہ ہے کہ موروثی بادشاہت کے خلاف اسوۂ امام حسینؓ کا شد و مد سے تذکرہ بھی کرتے ہیں اور ان بادشاہوں کی غاشیہ برداری بھی کرتے ہیں جنہوں نے اسی طرح سلطنت وراثت میں حاصل کی ہے۔ یہ ان کی موروثی بادشاہت کے خلاف ایک حرف زبان تک نہیں لاتے۔

یہی حضرات' آنے والوں کے لئے اسلاف ہوں گے!

۹۔ **سوال** ۔ قرآن شریف کے منجانب من اللہ ہونے کا ثبوت کیا ہے؟

جواب ۔ اس کا یہ دعوےٰ کہ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا

قرآن کی صداقت کا ثبوت

بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ (۲/۲۳ و دیگر مقامات)۔ "اگر تمہیں اس کتاب میں جسے ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے کسی قسم کا شبہ ہو (کہ یہ خدا کی طرف سے نہیں ہے) تو اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ تم اس کی کسی سورت کے مانند کوئی سورت بنا لاؤ!" قرآن کا یہ دعویٰ' اس کے یوم نزول سے لے کر آج تک ساری دنیا کے سامنے چلا آ رہا ہے۔ اور کسی کو اس چیلنج کے قبول کرنے کی ہمت نہیں پڑی۔ یہ چیلنج اس دور کے متشککین کے لئے بھی کھلا ہے۔

یہ ہے قرآن کے من جانب اللہ ہونے کا ثبوت اور شہادت۔ یعنی قرآن اپنا ثبوت آپ ہے۔

۱۰۔ **سوال** ۔ صحیح اسلامی حکومت قائم ہونے کا امکان کس ملک میں ہو سکتا ہے۔

جواب ۔ جو ملک بھی اپنے ذہن کو غیر قرآنی تصورات سے پاک کرلے اور اس کا فیصلہ کرلے کہ اس کا تمام کاروبار حدود اللہ

اسلامی حکومت کے قیام کا امکان

(قرآن کریم) کے اندر رہتے ہوئے سرانجام پائے گا۔ اگر آج کوئی غیر مسلم قوم قرآن کی تعلیم سے علیٰ وجہ البصیرت متاثر ہو کر اسلام لے آئے تو ان کے ہاں صحیح اسلامی حکومت آسانی سے قائم ہو سکتی ہے۔ کیونکہ ان کا ذہن غیر قرآنی تصورات سے پاک ہوگا۔

۱۱۔ **سوال** ۔ اسلامی حکومت باہمی مشورے سے قائم ہوگی۔ لیکن اگر یہ مشورہ مردوں تک ہی محدود ہو تو ملک کی آدھی آبادی حق مشاورت سے محروم ہو جائے گی۔ کیا اسلام میں جمہوریت کا یہی تصور ہے؟

جواب ۔ اسلامی حکومت میں عورتیں حق مشاورت سے محروم نہیں قرار دی جا سکتیں۔ قرآن کریم نے جہاں کہا ہے کہ

عورتوں کا حق مشاورت وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) ۔ ان کی حکومت مشاورت پر مبنی ہوگی۔ تو وہاں اس مشاورت کو مردوں تک ہی محدود نہیں رکھا گیا۔ وہاں تمام مومنوں کا ذکر ہے جن میں مرد اور عورت سب شامل ہوتے ہیں۔ اسی طرح جہاں قرآن نے تمکن فی الارض۔ یا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرائض کا ذکر کیا ہے، وہاں بھی یہ تخصیص نہیں کی کہ یہ جماعت مومنین میں سے صرف مردوں کا حق ہے۔ عورت کو اس میں شریک نہیں کیا جا سکتا۔

۱۲۔ **سوال** ۔ آج کل عائلی قوانین کو منسوخ کرنے کا سوال درپیش ہے۔ اس کا فیصلہ اسمبلی کریگی۔ جس میں ایک سو پچاس ممبروں میں صرف پانچ چھ عورتیں ہیں۔ یعنی ایسے قوانین کا فیصلہ، جن کا تعلق عورتوں کی موت اور زندگی سے ہے، مردوں کی اکثریت کرے گی۔ کیا اسلامی جمہوریت اسی کو کہتے ہیں؟

جواب ۔ نہیں۔ اسلامی جمہوریت اسے نہیں کہتے۔ اسلامی جمہوریت میں، نہ مرد عورتوں کے لئے فیصلہ کرتے ہیں، نہ عورتیں مردوں کے لئے۔ اس میں سب فیصلے خدا کی کتاب کے مطابق ہوتے ہیں، جو عورتوں اور مردوں، دونوں کے لئے یکساں ضابطۂ حیات ہے۔

اسلام اور جمہوریت ۱۳۔ **سوال** ۔ آج کل یہ سلوگن عام کیا جا رہا ہے کہ اسلام اور جمہوریت پاکستان کے دوستون ہیں۔ اس کا صحیح مطلب کیا ہے؟ کیا اسلام میں جمہوریت شامل نہیں؟

جواب ۔ اس کا مطلب انہی سے پوچھئے جو اس سلوگن کو لے کر اٹھے ہیں۔ ہمارے ہاں سلوگن خاص مقاصد کے ماتحت وضع ہوتے ہیں اور انہی مقاصد کے حصول کے لئے بلند کئے جاتے ہیں۔ اسلام کو ان میں سپر کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ پاکستان کی بنیاد "اسلامی جمہوریت" پر ہے تو یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ اسلام اور جمہوریت، پاکستان کے دوستون ہیں، ایسے ہی ہے جیسے (مثلاً) یہ کہا جائے کہ اسلام اور عدل، اسلامی حکومت کے دو ستون ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جب اسلام کہا جائے تو اس میں عدل شامل نہیں ہوتا۔ اس لئے اسلام کے ساتھ عدل کی شرط عائد کرنا بھی ضروری ہے۔

لیکن اگر "جمہوریت" سے مراد، مغربی انداز جمہوریت ہے جس میں پارلیمان کی اکثریت کے فیصلے بلا شروط مبنی برحق سمجھے جاتے اور ملک کا قانون بن جاتے ہیں، تو یہ وہ جمہوریت تھی جس سے پیچھا چھڑانے کے لئے پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا، اور جو اسلام کی عین نقیض ہے۔ لہٰذا اس مفہوم کی رو سے، اسلام اور جمہوریت، دو متضاد نظریات ہیں جو کبھی یکجا نہیں ہو سکتے۔

اسلامی حکومت کی بنیاد قرآن ہے اور یہ وہ جامع ضابطۂ زندگی ہے جس میں صحیح جمہوریت خود بخود آ جاتی ہے۔

اسلام اور کمیونزم ۱۴۔ **سوال** ۔ اگر اسلامی مملکت کا فریضہ تمام لوگوں کی ضروریات پوری کرنا ہے تو یہی مقصد کمیونزم کا بھی ہے پھر ان دونوں میں فرق کیا ہے؟

جواب ۔ اسلامی مملکت کا فریضہ صرف لوگوں کی طبیعی ضروریات پورا کرنا نہیں۔ وہ طبیعی ضروریات کے پورا کرنے کی ذمہ داری اس لئے لیتی ہے کہ انسان، ان ضروریات کی طرف سے مطمئن ہوکر، وحیِ خداوندی کی روشنی میں، بلند انسانی زندگی بسر کرنے کے قابل ہوسکے۔ اور اس طرح اس دنیا میں بھی عزت کی زندگی جئے اور اس کے بعد کی زندگی میں، اپنی ذات کی نشوونما کے لئے مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہوسکے۔ کمیونزم کی رُو سے انسان کی زندگی اسی طبیعی دنیا کی زندگی ہے۔ اس لئے انسانی زندگی کا منتہیٰ طبیعی ضروریات کا پورا ہونا ہے اور بس۔ یہ خالص حیوانی سطح کی زندگی ہے۔ کمیونسٹ نظام میں، انسانی ذات کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ اس میں انسان کا جسم تو زندہ رہتا ہے (وہ بھی اس وقت تک جب تک مملکت کو اس کے زندہ رکھنے کی ضرورت ہو) لیکن انسانیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ان کے ہاں، انسانیت کی مستقل اقدار کا تصور ہی نہیں۔

حضورؐ کا اسوۂ حسنہ

۱۵۔ سوال ۔ کیا رسول اللہؐ کے اسوۂ حسنہ کا اتباع ہمارے لئے ضروری ہیں۔ جب رسول اللہؐ نے ایک پیسہ بھی جمع نہیں کیا اور نہ ہی کچھ ورثہ چھوڑا ہے تو کیا ہمارے لئے یہی اسوہ نہیں؟ اور اگر یہی ہے تو پھر قرآن میں ترکہ اور وراثت کے احکام کیوں ہیں؟

جواب ۔ رسول اللہؐ کی حیاتِ طیبہ ہمارے لئے اسوۂ حسنہ ہے۔ قرآن، مومن کی زندگی کا جو تصور پیش کرتا ہے اس کی مکمل ترین مثال حضورؐ کی سیرت تھی۔ اسی لئے وہ ہمارے لئے نمونہ بنتی ہے۔ حضورؐ نے اس کی مثال قائم کی۔ اور جماعتِ مومنین بتدریج اس منتہیٰ کی طرف بڑھتی گئی۔ لیکن اس قسم کی زندگی اس نظام کے اندر ہی ممکن ہے جو قرآنی خطوط کے مطابق قائم کیا جائے یہی وہ نظامِ معاشرہ تھا جس کے اندر یہ جماعت اس منتہیٰ کی طرف بڑھتی گئی تھی۔ اس نظام میں کسی فرد کو ضرورت ہی نہیں رہتی کہ وہ مال جمع کرے اور اپنے ورثا کے لئے جائدادیں چھوڑے۔ لیکن یہ نظام بتدریج قائم ہوتا ہے۔ جب تک یہ قائم نہ ہو، لوگوں کے پاس مال بھی جمع ہوتا ہے اور وہ ترکہ بھی چھوڑتے ہیں۔ اور یہ ترکہ، وراثت کے احکام کے مطابق تقسیم ہوتا ہے۔ اس نظام کے قیام کے بعد، نہ کوئی ترکہ چھوڑتا ہے نہ اس کی تقسیم کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ یہی اسلامی زندگی کی آخری شکل ہے جس کی مثال حضورؐ نے قائم کرکے دکھائی۔ لیکن ہماری حالت عجیب ہے۔ ہمارے ہاں سنتِ رسول اللہؐ کے اتباع پر اس قدر زور دیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس طرزِ زندگی کو عین اسلامی بھی بتایا جاتا ہے جس میں لوگ دھڑا دھڑ مال جمع کرتے جائیں۔

صحابہ کبارؓ کی زندگی

۱۶۔ سوال ۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ بڑے بڑے اولوالعزم صحابہؓ کے پاس دولت کے انبار ہوتے تھے۔ اس کی کیا وجہ تھی؟

جواب ۔ اگر تاریخ کا یہ بیان صحیح ہے تو یہ اس زمانے کی بات ہو سکتی ہے جب اسلامی نظام ہنوز اپنی مکمل شکل میں قائم نہیں ہوا تھا۔ ورنہ آپ خیال کرسکتے ہیں کہ قرآن کریم، دولت کے انبار جمع کرنے کو اتنی سختی سے روکے۔

نبی اکرمؐ، قرآن کی اس تعلیم پر عمل کر کے نمونہ پیش کریں۔ اور صحابۂ کبارؓ (معاذ اللہ) اس کے خلاف زندگی بسر کریں؟ اس کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اس ضمن میں ایک اصول یاد رکھیے۔ صحابہ کبارؓ، رسول اللہ کے سچے متبع تھے۔ اور رسول اللہ کی زندگی عین مطابق قرآن تھی۔ اس لئے اگر ہمیں تاریخ میں صحابۂ کبارؓ یا خود نبی اکرمؐ کے متعلق کوئی ایسی بات ملے جو قرآن کے خلاف ہو تو ہمیں بلا تامل کہہ دینا چاہیئے کہ تاریخ کا وہ بیان صحیح نہیں۔ رسول اللہ اور صحابۂ کبارؓ کی زندگی کے مطابق قرآن ہونے کی شہادت خود قرآن دیتا ہے۔ جب ایک طرف قرآن کی شہادت ہو (جو خود خدا کی شہادت ہے) اور دوسری طرف تاریخ کا کوئی بیان ہو (جو بہر حال انسانوں کی جمع اور مرتب کردہ ہے) تو قرآنی شہادت کو بہر حال قبول کیا جائے گا، وہ جو کچھ اس کے خلاف ہو اسے مسترد کر دیا جائے گا۔ اگر ہم اپنی تاریخ کا مطالعہ اس اصول کے مطابق کریں گے، تو عہد محمدؐ رسول اللہ والذینؓ معہٗ کا صحیح تصور ہمارے سامنے آجائے گا۔

وحدتِ اُمّت

۷۔ سوال۔ مسلمان اس قدر مختلف عقائد میں بٹ چکے ہیں اور غور و فکر سے ہٹ کر اپنے باپ دادا کے طریقوں پر اس طرح اڑے ہوئے ہیں کہ کوئی کوشش انہیں ایک مرکز پر جمع نہیں کر سکتی۔ بلکہ اور فرقوں کا اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ وہ کون سا طریقہ ہے جس سے اُمت ایک جگہ جمع ہو کر قرآن پر چلے؟

جواب۔ اس کا صرف ایک طریقہ ہے۔ اور وہ یہ کہ مملکت ایسے قوانین بنائے جو قرآن کے مطابق ہوں اور ان کا اطلاق تمام فرقوں کے مسلمانوں پر یکساں ہو۔ اس سے، موجودہ تفرقت اور انتشار رفتہ رفتہ ختم ہو جائے گا۔ اور امت میں وحدت پیدا ہو جائے گی۔

ضروری اعلان

سنہ ۱۹۵۸ء سے قبل کی طلوع اسلام کی فائلوں کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی صاحب انہیں فروخت کرنا چاہیں تو ادارہ کو مطلع فرمائیں ——— ادارہ

محترم مولانا عبدالرب صاحب

کلمۂ طیّب

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ

ترجمہ ۔ اللہ کے سوا کسی اور کی اطاعت نہیں ہے۔ محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے پیغام پہنچانے والے ہیں۔ (جس کی اطاعت کی جائے وہ "الٰہ" ہے)

مطلب ۔ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے الفاظ دہرا کر انسان اپنے آپ سے عہد کرتا ہے کہ میں زندگی کے ہر کام میں ان باتوں پر عمل کروں گا جو اللہ نے اپنے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ انسان کو بتائیں اور جنہیں حضورؐ نے قرآن کریم میں لکھوا دیا اور اللہ نے اس کی حفاظت کا ذمہ لے لیا۔

۲۔ کلمۂ طیب وہ اعلان ہے جو انسانؐ مسلمانوں کی جماعت میں داخل ہونے کے لیے مسلمانوں کی جماعت کے سامنے کرتا ہے لیکن ہم میں سے تو کسی نے اس عہد کا اعلان اس طرح کبھی نہیں کیا۔ کیونکہ ہم تو پیدائشی مسلمان ہیں مسلمان گھر میں پیدا ہوئے اس لئے مسلمان ہیں۔ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہم نے زبان سے بالیقین دہرا دیا ہے۔ مگر اس کے مطلب کی طرف نہ کبھی دھیان دیا اور نہ کبھی کسی کے سامنے اس عہد کے اعلان کی ضرورت سمجھی۔ بس خود کو مسلمان سمجھتے اور کہلاتے رہے۔

اذان کی آواز آئی تو "جل شانہٗ"۔ چھینک آئی تو "الحمدللہ"۔ کوئی اچھی چیز کھائی تو "سبحان اللہ"۔ "ماشاءاللہ" اور کسی کی موت کی خبر سنی تو "انا للہ وانا الیہ راجعون" پڑھ دیا۔ مسجد کو اللہ کا گھر سمجھا۔ رمضان میں افطاری کے انتظامات کئے عیدین پر نئے کپڑوں کا اور عیدگاہ آنے جانے کا اہتمام کیا۔ قربانیاں کیں۔ اور گوشت خوری کو مسلمانی کا نشان سمجھا۔ ہاں موت کے بعد سویم پر قرآن خوانی بھی کی۔ یہ اور اسی قسم کی چند اور باتیں ہمارے مسلمان ہونے کے لیے کافی سمجھی جاتی ہیں۔ کیونکہ واعظوں سے برابر سنتے چلے آئے ہیں کہ جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا وہ جنت میں داخل ہوا۔ اگرچہ تقریب کے دور میں کبھی کبھی یہ بھی کہہ جاتے ہیں کہ —

یہ شہادت گہِ اُلفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

پیدائشی مسلمانوں سے دنیا بھری پڑی ہے۔ کوئی

ساٹھ کروڑ بنتا ہے۔ کوئی ستر کروڑ۔ شمالی افریقہ۔ جنوبی ایشیا۔ ساٹرا جاوا وغیرہ میں کوئی دس ہزار میل تک پیدائشی مسلمانوں کی لگاتار آبادی ہے لیکن یہ کروڑوں کی آبادی سب کی سب زندگی کے ہر میدان میں پیچ اور پست ہے۔ پہلے یورپ والوں کی غلامی تھی۔ اب جو آزادی آئی تو سنبھالے نہیں سنبھلتی۔ آپس کے جھگڑے ہیں کہ ختم ہونے میں نہیں آتے۔

۳۔ مومن مسلمان کو قرآن کہتا ہے "الاعلون" کہا ہے۔ یعنی بلند اور غلبہ والا۔ غلبہ انسانوں پر نہیں بلکہ ان بھرپور خزانوں کی منصفانہ تقسیم پر جو اللہ تعالےٰ نے زمین میں بھر رکھے ہیں۔ پانی۔ اناج۔ پھل۔ چارے کے خزانے سونا۔ چاندی۔ لوہا۔ تانبا وغیرہ دھاتوں کے خزانے تیل اور گیس اور خدا جانے کس کس نعمت کے خزانے۔ مومن مسلمان زمین کے خزانوں پر غلبہ پاکر انہیں ضرورت مند انسانوں میں اس طرح تقسیم کرتا ہے کہ ہر ایک کو جتنی چیز چاہیئے اتنی مل جائے۔ ایسی حصہ رسدی تقسیم کی غرض سے زمین کے خزانوں پر قبضہ، صرف اللہ تعالےٰ کے بتائے ہوئے اصولوں پر چل کر ہو سکتا ہے۔

۴۔ پیدائشی مسلمان کو مومن مسلمان بننے کے لئے تھوڑی ذہنی کاوش اور کچھ ہمت چاہیئے۔ پہلے کلمہ طیبہ کا مطلب ذہن نشین کرے۔ پھر پختہ ارادہ کرے کہ زندگی کے ہر کام میں اللہ تعالےٰ کی ان باتوں کو سامنے رکھے گا اور ان کی پابندی کرے گا جو اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے چودہ سو سال پہلے انسانوں کو بتائیں اور جو اب قرآن کریم میں اسی طرح لکھی ہوئی ہیں۔ پھر وہ قرآن کی باتوں کو ایک ایک کرکے سمجھے اور ان پر چلنے کی پوری کوشش کرے۔

۵۔ (مثلاً) قرآن کریم نے ایک بات یہ بتائی ہے کہ ہر انسان کو پوری ہمت سے محنت کرنی چاہیئے —— —— اور محنت کے بدلے میں جو ملے صرف اسی کو اپنا حق سمجھنا چاہیئے۔ سورۃ النجم کی تریپنویں آیت میں ہے "لیس للانسان الا ما سعیٰ" انسان کا صرف اتنا ہی حق ہے جتنے کے لئے وہ محنت کرے۔ مومن مسلمان جس کام کا ذمہ لے گا اسے سمجھ بوجھ، محنت، ہوشیاری اور ایمانداری سے کرے گا خواہ اس پر کوئی نگران ہو یا نہ ہو اور جب کام پورا ہو جائے گا تو جو اجرت ٹھیری تھی اس سے زیادہ نہیں مانگے گا۔ پیدائشی مسلمان کی حیثیت سے وہ کام کا ذمہ تو لیتا تھا اور اجرت بھی ٹھیراتا تھا مگر اس کا شیوہ یہ تھا کہ سستی اور بے پرواہی سے کام کو الٹا پلٹا کسی طرح ختم کیا۔ مالک کی آنکھوں میں خاک جھونکی اور چرب زبانی سے سمجھا بجھا کر اس سے پوری اجرت وصول کر لی لیکن کلمہ طیبہ کا عہد کرنے کے بعد وہ پست ہمتی اور حیلہ بازی سے بیزار ہو چکا ہے۔ اب وہ سب کچھ وعظ کے عین مطابق کرتا ہے

۶۔ ایک مومن مسلمان کی نسبت سنا کہ اس نے ملازمت کی اور تنخواہ۔ کام کا وقت وغیرہ طے کر لئے۔ کام کے وقت میں اگر کوئی ملنے آتا یا اسے خود کسی ضرورت سے جانا ہوتا تو وقت لکھ لیتا۔ اور مہینہ کے آخر میں اسے جوڑ کر حساب سے اس وقت کی جتنی اجرت بنتی وہ تنخواہ میں سے واپس کر دیتا ایسی محتاط طبیعت پر بعض لوگوں کو ہنسی آئے گی لیکن اس کی اصول پرستی کی ہر شخص دل سے داد دیگا کہ اس نے صرف اپنی محنت کی اجرت کو اپنا حق سمجھا۔ کلمہ گو مسلمان کا مقام یہی ہے کہ محنت کرے اور محنت کی جائز اجرت سے زیادہ طلب نہ کرے۔

ہر بہی خواہ کا گلا گھونٹنے والی قوم

ایک اقتباس

سر سید نے اصلاحی تحریک کی راہ ہموار کر کے اور اس کو کامیاب بنانے کے لئے تہذیب الاخلاق جاری کیا تھا اور انہوں نے اپنی کئی تحریروں میں ان مقاصد کو واضح بھی کر دیا تھا۔ یہ مقاصد کیا تھے اور اصلاحی کوششوں کی نوعیت کیا تھی۔ اس کی تفصیل سر سید کے ایک ممتاز رفیق کار خواجہ الطاف حسین حالی نے یوں بیان کی ہے کہ اس پرچہ کی تمام تر کوشش اس بات میں تھی کہ جو خیالات مسلمانوں کی ترقی اور تمدن کے مذہبی مانع سمجھے جاتے تھے لیکن درحقیقت مذہب سے کچھ علاقہ نہیں رکھتے تھے، ان کو جہاں تک ہو سکے رفع کیا جائے اور اسلام پر عیسائیوں کا جو یہ اعتراض ہے کہ وہ ترقی اور تمدن کا دشمن ہے، اس غلطی کا اصل منشا ظاہر کیا جائے۔ اس کے علاوہ یورپ کی تہذیب کے اصول و فروع سے اور ان اسباب سے جو یورپ کی ترقی کے باعث ہوئے ہیں، قوم کو آگاہ کیا جائے۔ بیہودہ اور مضر رسموں سے ان کو نفرت دلائی جائے۔ اخلاق و عادات میں جو بہ سبب قومی تنزل کے خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں وہ بیان کی جائیں۔ علوم قدیمہ کی عظمت جو لوگوں کے دلوں میں حد سے زیادہ بیٹھی ہوئی ہے۔ جہاں تک اس میں غلطی ہو اس کو ظاہر کیا جائے۔ علوم جدیدہ جن سے نفرت کی جاتی ہے ان کی اصلی اور واقعی خوبیاں اور جو عمدہ نتائج دنیا میں ان سے پیدا ہوئے ہیں جتائے جائیں۔ اور بجائے نفرت کے ان کی طرف رغبت دلائی جائے۔ اسلام میں مخالفوں نے جو باتیں تاریخی اور علمی تحقیقات کے خلاف بیان کی ہیں ان کو تاریخ اور علم کے ساتھ منطبق کیا جائے۔ یا اسلام کا دامن ان سے پاک ثابت کیا جائے۔ مسلمانوں کے دلوں میں ان کے اکابر و اسلاف کی عظمت کا خیال پیدا کیا جائے۔ ان کی قدیم علمی اور عملی ترقیات ان کو یاد دلائی جائیں۔ اور اس طرح قوم کے مردہ دلوں کو از سر نو زندہ کرنے میں کوشش کی جائے۔" یہ بڑے اہم مقاصد تھے اور ان کے لئے سر سید نے اپنی تمام صلاحیتیں وقف کر دی تھیں۔ دینی مسائل کی اہمیت کے ساتھ ہی وہ ان کی نزاکت سے بھی بخوبی واقف تھے اور اس بات کا پورا خیال رکھا کہ صرف اپنی رائے اور اجتہاد سے کام نہ لیا جائے بلکہ تہذیب الاخلاق میں جو کچھ مذہب کے متعلق لکھا جائے وہ زیادہ تر قوم کے محققین کی تصنیفات سے استفادہ کر کے لکھا جائے اور اخلاق و

معاشرت اور ترقی و تمدن کے متعلق مصنفین کے خیالات بھی جہاں تک ہو سکے اپنی زبان میں بیان کئے جائیں۔

اس قدر احتیاط سے کام لینے کے باوجود قدامت پرست عناصر نے تہذیب الاخلاق کے جاری ہوتے ہی اسکی شدید مخالفت شروع کر دی۔ اس کے مضامین کو گمراہ کن قرار دیا۔ کئی اخبار اور رسالے اس کی مخالفت میں جاری کئے گئے جن میں کانپور کا "نورالآفاق" بہت مشہور ہوا۔ تہذیب الاخلاق کے مضامین کے جواب میں اور سرسید کی تحریک کے خلاف مضامین شائع ہونے لگے۔ سرسید کی تکفیر کے فتوے دیے گئے۔ ان کو مرتد، زندیق، اور اسلام کا دشمن کہا گیا۔ ان کے رفقاء کو بھی نیچری اور کرسٹان کہا جانے لگا۔ اور اصلاحی تحریک کے خلاف قدامت پرستوں کا ایک طاقتور محاذ بن گیا۔ اس زمانے کے حالات کو دیکھتے ہوئے یہ مخالفت بالکل متوقع تھی اور سرسید بھی یہ جانتے تھے کہ ان کو کس قدر مخالف طاقتوں کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ اور اس کے لئے کیسے عزم و استقلال کی ضرورت ہے۔ تہذیب الاخلاق اسی عزم کی تکمیل میں مدد دینے کی غرض سے جاری کیا گیا تھا اور اس کا مفید نتیجہ یہ نکلا کہ سرسید کی اصلاحی تحریک چند سال کے عرصہ میں پورے ملک میں پھیل گئی۔ اور رفتہ رفتہ مسلمانوں کا ایک معتدبہ گروہ ایسا بن گیا جو اس کے مضامین سے بہت متاثر ہوا۔ اور معاشرہ کی ہمہ جہتی اصلاح و ترقی کی ضرورت و اہمیت کو پوری طرح محسوس کرنے لگا۔ اس گروہ کے تعاون اور امداد سے سرسید اپنی کوششوں میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے اور ان کی تحریک کی بنیادیں مستحکم ہو گئیں۔

(بہ شکریہ تہذیب الاخلاق دسمبر سنہ ۶۲ء)

طلوعِ اسلام

یہ اسی "کافر۔ مرتد۔ زندیق۔ ملحد۔ بے دین" کا تصدق ہے کہ آج اُسے کافر قرار دینے والوں کی اولاد، ایک آزاد مملکت (پاکستان) کی مالک ہے ——— لیکن اس کے باوجود اس قوم کی خوئے کافرگری میں فرق نہیں آیا۔

ضرورتِ رشتہ

قرآنی تعلیمات سے دلی وابستگی رکھتے ہوئے طبعاً یہ چاہتا ہوں کہ اپنی لڑکی کا رشتہ قرآنی احباب کے حلقہ میں کروں تاکہ اسے شرفِ انسانیت نصیب ہو اور وہ محض غلام بن کر نہ رہ جائے۔ لڑکی اَن پڑھ ہے اور میں خود اسقدر غریب کہ جہیز وغیرہ رسوم کے اخراجات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ خط و کتابت ذیل کے پتہ پر کی جائے۔ (اے، ایم، بیٹ۔ معرفت طلوعِ اسلام (گلبرگ) لاہور)

مفہوم القرآن

نوجوان تعلیم یافتہ طبقے سے یہ شکایت عام طور پر سننے میں آتی ہے کہ موجودہ ترجموں سے قرآن کریم سمجھ میں نہیں آتا اور تفسیریں ایک تو بہت طویل ہوتی ہیں اور دوسرے ان سے اور الجھاؤ پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ شکایت حقیقت پر مبنی ہے۔ اس مشکل کو رفع کرنے کے لئے قرآن کریم کے سمجھنے اور سمجھانے کا ایک نیا انداز اختیار کیا گیا ہے یعنی قرآن کریم کے مفہوم کو ایسی رواں اور مربوط عبارت میں پیش کیا گیا ہے کہ اس سے قرآنی تعلیم کے سمجھنے میں ذرا دشواری نہیں ہوتی اور پورا قرآن ایک مسلسل کتاب کی طرح پڑھا جا سکتا ہے۔ (نو پارے شائع ہو چکے ہیں۔)

جب آپ اسے دیکھیں گے تو آپ ہم سے متفق ہوں گے کہ یہ قرآن کریم کے سمجھنے اور سمجھانے کا واقعی نیا اور بڑا کامیاب انداز ہے۔ قیمت۔ پارہ اول تین روپے۔ اس کے علاوہ ہر پارہ کی قیمت۔ دو روپے

اعلیٰ کتابت اور بلاک کی چھپائی

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ

۲۷ - بی شاہ عالم مارکیٹ - لاہور

تیری نظر میں ہیں تمام میرے گذشتہ روز و شب

(اقبالؒ)

اِحتسَاب

(۸)

تحریکِ پاکستان کا منتہیٰ و مقصود ایک ایسے جداگانہ خطۂ زمین کا حصول تھا۔ جہاں دینِ خداوندی کو اپنی کارفرمائی کے لئے واقعی میسر ہوں اور اس کی عطا فرمودہ اقدارِ حیات نشو و ارتقاء کے تدریجی مراحل طے کرتے ہوئے ایک مثالی معاشرہ کا حرفِ آغاز قرار پا سکیں۔ اپنے اس پیش نہاد کے اعتبار سے یہ تحریک، اسلام اور ملتِ اسلامیہ کے دوستوں اور دشمنوں کے مابین ایک خطِ امتیاز کی حیثیت اختیار کر گئی۔ اور طلوعِ اسلام نے اس کی والہانہ رفاقت اور حمایت کا جو حق ادا کیا وہ ہزاروں صفحات کی صورت میں ہماری تاریخ کا ایک درخشندہ اور قابلِ فخر باب قرار پا گیا۔ یہ ایک مقدس فریضہ تھا جس کی شایانِ شان ادائیگی سزاوارِ تبریک ہے۔

حصولِ پاکستان کے بعد ایک نئی منزل طلوعِ اسلام کے سامنے تھی۔ اب معاملہ اس نئی مملکت کے کارفرماؤں سے تھا۔ دورِ اقتدار کے جام و سبو کی یہ نئی گردش ان تازہ واردانِ بساطِ سیاست پر بے خودی کی سی کیفیت طاری کئے جا رہی تھی۔ اور یہ اندیشہ کروٹ لے رہا تھا کہ اس عالمِ بے خودی میں ہماری کشتی کے یہ ناخدا ساحلِ مراد سے اپنا رُخ نہ پھیر لیں۔ اور کعبۂ مقصود نگاہوں سے اوجھل نہ ہو جائے۔ چنانچہ طلوعِ اسلام نے فریضۂ حیات کی پکار کو مردانہ وار لبیک کہا اور ہر قسم کی مجبوریوں اور مصلحت کوشیوں سے بالاتر ہو کر اس نے اربابِ اقتدار کے اٹھتے ہوئے ہر غلط قدم کا محاسبہ کیا۔ ہر ناروا روش پر انہیں پوری جرأت سے ٹوکا۔ اور علیٰ وجہ البصیرت صحیح منزل کی نشان دہی کی۔ یہ سلسلۂ احتساب طلوعِ اسلام کی گزشتہ پندرہ برس کی اشاعتوں میں سینکڑوں صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور صورتِ حال کی مناسبت سے، عنوانِ بالا کے تحت، اسی کی بعض اہم جھلکیاں قارئین کے سامنے لائی جا رہی ہیں۔ اس سلسلہ کی آٹھویں قسط اشاعتِ زیرِ نظر میں حاضر کی جا رہی ہے۔ "دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو"

(ادارہ)

اندھیرے میں روشنی کی کرن

وحدت مغربی پاکستان کے مسودہ قانون پر دستور یہ میں جو کچھ تقریروں میں کہا گیا یہ ملک کے ہر باشعور اور مخلص شہری کے لئے یقیناً باعث ماتم تھا۔ لیکن اس اندھیرے میں روشنی کی کچھ کرنیں بھی پھوٹ کر سامنے آئیں۔ نواب مشتاق احمد گورمانی کی جامع، مدلل اور فصیح و بلیغ تقریر اسی نوع کا ایک شاہکار تھی جس پر تبصرہ کرتے ہوئے طلوع اسلام نے یوں خراج تحسین پیش کیا۔

> پاکستان کی مجلس دستور ساز میں جس ہڑبونگ اور پھوہڑپن (بلکہ بالفاظ صحیح شہدا پن) کا مظاہرہ ہو رہا ہے اس میں کسی شخص کا اپنے عقل و دماغ کے توازن کو قائم رکھنا من عزم الامور تھا لیکن ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس ہجوم میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اس قسم کے "اضطراب موج" میں "سکون گہر" کی صلاحیت اپنے اندر رکھتے ہیں۔ ان میں محترم مشتاق احمد گورمانی کا نام ہمیں سرفہرست نظر آتا ہے ان کی وہ تقریر جو انہوں نے وحدت مغرب کی تائید میں کی، ایک پرشور اور متلاطم سمندر میں روشنی کے مینارہ کی طرح دکھائی دیتی ہے۔
>
> بجو و خزیدہ و محکم چو کوہساراں
>
> واضح، مدلل، صاف، سلجھی اور نکھری ہوئی یکسر حقائق پر مبنی اور اس کے ساتھ ہی نہایت شگفتہ اور شاداب۔ تقریر سن کر بے ساختہ کہنا پڑتا ہے۔
>
> دیدہ ام مرشے ودریں قحط الرجال
>
> اس تقریر کو یقیناً دنیا کے بہترین پارلیمانی مباحثات اور مذاکرات میں بطور نظیر پیش کیا جا سکتا ہے۔ مسٹر گورمانی نے جس محنت اور کاوش سے اپنے دعوے کی تائید میں حقائق فراہم کئے ہیں اور جس نظم و ربط اور اطمینان و سکون سے انہیں پیش کیا اس کے لئے وہ یقیناً مستحق تبریک و تہنیت ہیں۔ یہ تقریر اس قابل ہے کہ اسے غور سے پڑھا جائے اور بطور تاریخی دستاویز محفوظ رکھا جائے۔
>
> (شمارہ ۲۴ ستمبر ۔ ص۲)

ہدیہ تبریک و تہنیت

۳۰ ستمبر ۱۹۵۵ء کو وحدت مغربی پاکستان کا مسودہ قانون دستور ساز اسمبلی میں پاس ہو گیا۔ طلوع اسلام کی مسرتوں کی انتہا نہ پوچھئے۔ اپنی ملت کو اس کارنامہ پر خراج تحسین پیش کرتے ہوئے وہ "زندگی کی نئی کروٹ" کے عنوان سے لکھتا ہے۔

مقام تشکر ہے کہ پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جا سکا۔ اور اب اس شمع کی ضیا باریوں کے لئے انجمن آراستہ ہو رہی ہے۔ اس مسودے کی منظوری مجلسِ دستور ساز کا ایسا کارنامہ ہے جو تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہی نہیں رہے گا بلکہ اسے بہ اعتبار اہمیت قیام پاکستان کے بعد سرِفہرست رکھا جائے گا۔ یہ دو انقلابات (قیامِ پاکستان اور وحدتِ مغرب) جن ممکنات کے حامل ہیں ان کا کما حقہٗ احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی ایک وجہ تو قدرتی ہے اور وہ یہ کہ ہم خود اس انقلاب سے متاثر ہیں اور اس سے گزر رہے ہیں۔ اور دوسری افسوسناک وجہ یہ ہے کہ ہم میں بالعموم اس شعور کا فقدان ہے جو نگاہ کے سامنے سے گونا گوں پردے ہٹا کر اسے اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ دردِ دلِ شاخ پیچ و تاب کھانے والوں کو دیکھ لے ....

ان حالات میں وحدت کے مسودے کا منظور ہو جانا اس کی شہادت ہے کہ روحِ پاکستان جو صوبائیت کے ہاتھوں کچلی جا رہی تھی سنبھلنا شروع ہو گئی ہے۔ یہ گویا تمہید ہے پاکستان کی قیادت نو کی۔ معرکۂ وحدت، معرکۂ پاکستان سے کسی طور پر کم نہیں۔ تحریک پاکستان کی شاخ میں اب برگ و بار آنا شروع ہوا ہے۔ مستحق تبریک ہیں وہ جنہوں نے ممکنات زندگی کی نمود کے یہ سامان بہم پہنچائے اور کاروانِ ملت کو اپنے کعبۂ مقصود کی طرف جادہ پیمائی کا موقع مہیا کیا۔ ان کے برعکس جنہوں نے اس انقلاب کے دھارے کے آگے بند باندھنے کی کوشش کی۔ ان کو ہم مستقبل کے حوالے کرتے ہیں۔ جب ظہور نتائج کا وقت آئے گا یہ بند باندھنے والے تو موجود نہیں ہوں گے۔ لیکن نتائج ان پر واضح کر دیں گے کہ ان کی مخالفت ملت کو کس طرف لے جاتی ہے۔ (شمارہ ۸، اکتوبر ۱۹۵۵ء صفحہ ۵)

طلوع اسلام نے وحدتِ مغربی پاکستان کے مسودۂ قانون کی منظوری کو، قیامِ پاکستان کے بعد، قومی زندگی کا سب سے خوشگوار مرحلہ قرار دیا اور مذکورہ سطور کے بعد لکھا۔

بلاشبہ یہ دوسرا موقع ہے جو قدرت نے ہمیں عطا کیا ہے۔ پہلا موقع قیامِ پاکستان کا تھا جس کا کم از کم فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ اگر وحدتِ مغرب کا فیصلہ نہ ہوتا تو بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا تھا کہ قدرت نے قیامِ پاکستان کی صورت میں جو عظیم الشان موقع ہمیں عطا کیا تھا ہم نے اسے ضائع کر دیا۔ اب جبکہ یہ دوسرا موقع ہمیں ملا ہے تو ہم پر یہ لازم آ جاتا ہے کہ ہم اس کا پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے، اپنی تعمیری صلاحیتوں کو مکمل طور پر بروئے

کار لائیں۔ اب عمل کا جو وسیع میدان قدرت نے ہمارے سامنے رکھ دیا ہے اس میں موافقین و مخالفین کی کوئی تمیز نہیں ہونی چاہیئے۔ روح پاکستان اگر اول الذکر کو خراج تحسین پیش کرتی ہے تو آخر الذکر کو پوری فراخ حوصلگی سے معاف کرتی ہے۔ اور دونوں کو دعوت دیتی ہے کہ وہ اس خالی جبین پر اپنے قلم سے اپنی سرگزشت لکھیں۔ اور ان تقاضوں کو پورا کرنے کا عزم مصمم کرلیں جو تحریک پاکستان سے ہم نے اپنے ذمے لئے تھے۔ (ایضاً)

معاہدہ بغداد اور عالم اسلام

انہی ایام میں ایران نے معاہدہ بغداد میں شرکت کا فیصلہ کیا۔ ترکی، عراق، پاکستان اور برطانیہ پہلے ہی اس معاہدہ میں شامل تھے۔ ایران کی شمولیت نے جغرافیائی لحاظ سے اس معاہدہ کی تکمیل کردی۔ جہاں تک مصر کا تعلق تھا یہ معاہدہ اس کے مفاد کے خلاف جاتا تھا۔ چنانچہ اس نے اس معاہدہ کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کردیا اور عرب ممالک اس پروپیگنڈہ سے متاثر ہونے لگے۔ اسلامی ممالک میں اس خلفشار کا آغاز اسلامی اتحاد کے لئے کوئی اچھا شگون نہیں تھا۔ چنانچہ طلوع اسلام نے اس صورت حال کا بھرپور جائزہ لیا اور لکھا۔

> یہ کیفیت افسوسناک ہے۔ کیونکہ اس طرح نہ تو عرب ممالک کے اتحاد باہمی کی کوئی شکل پیدا ہوئی۔ اور نہ ان کی عسکری کمزوری کے رفع ہونے کی کوئی صورت نکلی۔ تفریق اور کمزوری نے ان کے لئے چند در چند مشکلات پیدا کردی ہیں۔ ان کی سب سے بڑی مشکل یہودی حکومت ہے اور اس کے قیام میں امریکہ کا سب سے زیادہ ہاتھ ہے۔۔۔ یہودی عربوں کے لئے ہی نہیں تمام عالم اسلام کے لئے مستقل خطرہ ہیں۔ جب تک یہ حکومت موجود ہے۔ عالم اسلامی میں امن قائم نہیں ہو سکتا۔ اس خطرے کے مقابلہ کے لئے ضروری ہے کہ عرب متحد بھی ہوں اور مستحکم بھی۔ (شمارہ اکتوبر ۵۵ء ص ۵)

اس کے بعد طلوع اسلام نے اس صورت حال کا تجزیہ کیا کہ مصر، امریکہ سے مایوس ہوکر، روس سے اسلحہ حاصل کرنے پر مجبور ہوگیا اور خارجی پالیسی کے اعتبار سے اسلامی ممالک دو کیمپوں میں تقسیم ہوگئے۔ اس صورت حال کے نتائج و عواقب پر روشنی ڈالتے ہوئے طلوع اسلام نے مزید بتایا کہ۔

> اب دنیائے اسلام کی صورت یہ ہوگئی ہے کہ ایک طرف ترکی۔ عراق۔ پاکستان اور ایران ہیں جو اسلحہ کی ضرورت امریکہ سے پوری کررہے ہیں اور کریں گے۔ دوسری طرف مصر ہے جو روس سے

اسلحہ خریدے گا۔ اور تیسری طرف بقیہ عرب ممالک ہیں۔ جن میں اتنی جرأت نہیں کہ وہ صاف طور پر ایک طرف ہوں یا دوسری طرف۔ وہ یہ دیکھتے رہیں گے کہ یہ اونٹ بالآخر کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ یہ صورت حال یقیناً اتحاد اسلامی کے منافی ہے اور یہی وہ صورت ہے جس پر ہم مسلمانوں کو پوری طرح سوچنے کی دعوت دیتے ہیں۔ (ایضاً)

اس صورت حال کا حل کیا ہے؟ اس اہم سوال کا جواب دیتے ہوئے طلوع اسلام نے آئندہ سطور میں یہ واضح کیا کہ۔

اگر مسلم ملک اپنا متحدہ محاذ قائم کرلیں تو روس اور امریکہ مجبور ہوں گے کہ انفرادی طور پر ایک ایک ملک کو شکار کرنے کی بجائے مرکزی ادارے سے بات کریں۔ اور معاملہ طے کریں۔ یہ ٹھیک ہے کہ امریکہ اس وقت یہودی حکومت کے بقا کو عربوں کے بقا پر ترجیح دے رہا ہے۔ اور اس کی سرد مہری کی وجہ سے مصر روس کی طرف متوجہ ہوا ہے۔ لیکن یہ بھی تو حقیقت ہے کہ تنہا مصر، امریکہ پر وہ دباؤ نہیں ڈال سکتا جو یہودیوں کا ہے۔ اگر عرب اور دوسرے مسلمان ممالک باہم اکٹھے ہو جائیں تو امریکہ کا رویہ آن واحد میں بدل جائے گا اور پھر وہ نہ برطانوی استعماریت کی حمایت کرے گا اور نہ ہمارے مطالبات کو ٹھکرا سکے گا۔ گویا آج جس بدسلوکی کی شکایت مصر کو ہے اس کا ازالہ ہو جائے گا۔ (ایضاً)

مہمانداری یا بے غیرتی؟

کراچی کی مشہور بین الاقوامی صنعتی نمائش میں ہندوستان نے اپنے اسٹال پہ جو نقشہ آویزاں کیا اس میں کشمیر کو ہندوستان کا حصہ ظاہر کیا گیا۔ اس پر کراچی کے غیور شہریوں نے ——— تقاضائے غیرت کی بنا پر شدید احتجاجی مظاہرہ کیا۔ مظاہرین کے ایک وفد نے اس سلسلے میں پاکستان کے وزیر خارجہ سے بھی ملاقات کی۔ لیکن اس کے باوجود ہماری حکومت کا رویہ بے حد افسوسناک ثابت ہوا جس کے نتیجہ میں نمائش میں ہنگامہ کی صورت پیدا ہوگئی۔ طلوع اسلام نے اصولی نقطۂ نظر سے اس صورت حال کے مضمرات پر روشنی ڈالتے ہوئے جہاں مظاہرین کے جوش غیرت کی تائید کی۔ وہاں نمائش کے ارباب انتظام کی مذمت بھی کی اور اس کے بعد حکومت کی روش پر تنقید کرتے ہوئے لکھا۔

ایک اطلاع کے مطابق جہاں وزیر خارجہ نے وفد سے یہ وعدہ کیا کہ وہ ہندوستانی ہائی کمشنر سے بات کریں گے وہاں یہ بھی کہا کہ ہندوستان ہمارا مہمان ہے۔ جہاں تک مہمانداری کا تعلق ہے اندنوں اور خود ہندوستان بھی پاکستان کے سلوک کی شکایت نہیں کر سکتا۔

لیکن کیا وزیر خارجہ کو یہ معلوم نہیں کہ مہمانداری میں مہمان پر بھی بعض پابندیاں عائد ہوتی ہیں۔ کیا ہندوستان کو اخلاقاً اس کا حق دیا جاسکتا ہے کہ وہ مہمان بن کر ہمارے پاس آئے اور ایسے نقشے ہمارے گھر میں لٹکائے؟ ذرا آپ دہلی میں مہمان بن کر جائیے اور کشمیر کو پاکستان کا حصہ دکھائیے۔ پھر دیکھئے آپ کی مہمان داری کیسی ہوتی ہے۔ خیر یہ ایک ضمنی بات ہے۔ جہاں تک وزیر خارجہ کے اس وعدہ کا تعلق ہے کہ ہندوستانی کمشنر سے بات کرکے نقشے کو ہٹوا دیں گے۔ وہ نمائش کے ختم ہونے تک پورا نہیں ہوا۔ کیا حکومت اس قدر بے بس تھی کہ وہ ہفتہ عشرہ میں یہ نقشہ بھی نہیں ہٹوا سکتی تھی۔ اگر وہ فوری طور پر مناسب کارروائی کرتی تو نمائش میں جو ہنگامہ ہوا وہ سرے سے پیدا ہی نہ ہوتا۔ یہ ہنگامہ سب کے لئے موجب عبرت ہے۔

(شمارہ ۲۲ ؍اکتوبر ۱۹۵۵ء صفحہ ۶)

اسلامی ممالک کیلئے لمحہ فکریہ ۳۱؍اکتوبر ۱۹۵۵ء کو ریڈیو پر یہ خبر نشر ہوئی کہ امریکہ و برطانیہ کی طرف سے مصر کو یہ الٹی میٹم دے دیا گیا کہ وہ اسرائیل کے خلاف اپنے جنگی اقدامات بند کردے۔ ورنہ یہ حکومتیں اسے کچل کر رکھ دیں گی۔ اسلامی ممالک جس انداز سے دو مختلف بلاکوں کی حاشیہ برداری اختیار کئے جا رہے تھے۔ ان کی موجودگی میں یہ انتباہ پورے عالم اسلام کے لئے کس قدر پرخطر تھا۔ طلوع اسلام نے اس کے نتائج و عواقب کا بجا طور پر احساس اور اسلامی اخوت کے بنیادی فریضہ کے پیش نظر ہیجان و اضطراب کا اظہار کرتے ہوئے "خطرہ سر پر" کے عنوان سے اپنے مقالہ میں لکھا۔

اس الحاد کا لازمی نتیجہ امریکی و روسی بلاکوں کا باہمی ٹکراؤ ہوگا۔ یعنی پاکستان۔ ایران عراق ترکی کے بلاک کا مصر، شام، سعودی عرب (اور افغانستان) کے بلاک سے ٹکراؤ۔ سوچئے کہ اس آسمان کے نیچے اس سے بدبخت شکل کوئی اور بھی ہوسکتی ہے کہ کرہ ارض کے اہم ترین خطہ کے مسلمان اس طرح باہم دگر ٹکرا ٹکرا کر آغشتہ خاک و خون ہو جائیں اور قیامت بر قیامت یہ کہ اسرائیل، جو پورے کے پورے جسد اسلامی کے لئے خار پہلو (ہی نہیں بلکہ خار چشم بھی) ہے۔ ان کی کمزوری کے بعد مزید طاقت حاصل کرلے۔ اف! کس قدر روح فرسا ہے یہ منظر اور کیسا جگر خراش ہے یہ تصور۔

(شمارہ ۵؍نومبر ۱۹۵۵ء۔ صفحہ ۷)

اس کے بعد طلوع اسلام پاکستان کے ارباب بست و کشاد کو یوں مخاطب کرتا ہے۔

> ہم پاکستان کے ارباب حل وعقد سے بھی درخواست کریں گے کہ وہ اسرائیل کے مسئلہ کو خاص اہمیت دیں۔ اور امریکہ و برطانیہ کی اس دھمکی کو صرف مصر کے خلاف سمجھ کر مطمئن نہ ہو جائیں یہ دھمکی (جواب بالواسطہ نہیں بلکہ بلاواسطہ اسرائیل کی تائید و تقویت کا اعلان ہے) پورے کے پورے عالم اسلام کے خلاف ہے۔ یہ نازک وقت حکومت پاکستان کی خارجہ پالیسی کے لئے سخت امتحان کا وقت ہے اور ملک کی نگاہیں ان کے فیصلہ کی منتظر ہیں۔ روس کی آئیڈیالوجی اور اسرائیل کی حکومت دونوں عالم اسلامی کے لئے تباہی کا موجب ہیں دیکھنا یہ ہے کہ پاکستان اس مرحلہ کو کس حسن کارانہ انداز سے طے کرتا ہے۔ (ایضاً)

نئی نسل اور کارفرماؤں کی ذمہ داری

آگے بڑھئے ۱۲۔ نومبر سنہ ۱۹۵۵ء کے طلوع اسلام میں مندرجہ بالا عنوان سے ایک اہم افتتاحیہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ ہماری نئی نسل تعلیم و تربیت کی گوناگوں خامیوں کے باعث تباہی کی راہوں پر بڑھی جارہی تھی اور یہ سب کچھ واضح طور پر، ملک کے تیرہ و تار مستقبل کا پیش خیمہ تھا۔ طلوع اسلام نے مندرجہ بالا عنوان سے اپنے لمعات میں تحریک پاکستان کے مقاصد کی نشان دہی کی اور پھر اس تخریبی شور و شر اور ہڑ بونگ کا تفصیلی نقشہ پیش کیا۔ جو ہمارے تعلیمی مرکزوں میں بپا تھی (اور آج بھی بپا ہے) اس اہم بنیادی اور نازک مسئلہ کے بارے میں ارباب حکومت کو ان کی ذمہ داری یاد دلاتے ہوئے اس نے اس بصیرت افروز مقالہ کے آخر میں کہا۔

> سوال یہ ہے کہ قوم کے ارباب حل وعقد اس باب میں کیا کر رہے ہیں؟ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ان کے نزدیک یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں جو کسی توجہ کا محتاج ہو۔ اس میں شبہ نہیں کہ جہاں تک ان کی اپنی ذات کا تعلق ہے انہیں اس باب میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی ان کے پاس دولت اور اختیارات دونوں ہیں۔ جن کے بل بوتے پر وہ اپنے بچوں کی تعلیم کا ایسا انتظام کر سکتے ہیں جس سے اعلیٰ ملازمتیں ہاتھ آسکیں اور اگر بفرض محال ان کی تعلیم اس انداز کی نہ بھی ہو سکے تب بھی ان کے لئے اقتدارات کی کرسیاں خالی ہوتی ہیں لیکن یہاں سوال کسی مخصوص طبقے کے چند بچوں کا نہیں۔ پوری کی پوری قوم کے بچوں کا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ایک ایسا مرکزی ادارہ قائم کیا جائے جو سیاسیات سے الگ رہ کر اپنی تمام جدوجہد کو تعلیم کے لئے وقف کر دے۔ سیاسی دھوپ چھاؤں آتی اور جاتی ہے لیکن تعلیم کا شجر طیب ہمیشہ سرسبز و شاداب رہتا ہے اور ہر موسم میں اپنے پھل دیتا ہے۔ (شمارہ ۱۲ نومبر ۵۵ء)

دیہات میں انقلاب

امریکہ کی طرف سے دیہی مد میں کروڑوں روپوں کی امداد اور اس پر مستزاد دیہات سدھار کی تحریکیں اپنے نتائج کے اعتبار سے جس قدر مایوس کن ثابت ہوئیں وہ سب کے سامنے ہے۔ پاکستان کے کروڑوں انسان دیہاتی فضا میں جس قسم کی زندگی بسر کرتے ہیں اس میں ایک خوش گوار انقلاب کا تقاضا ناقابل انکار ہے۔ طلوع اسلام نے بجا طور پر اس مسئلہ کی اہمیت محسوس کی اور اس سلسلے میں حقیقی راہ کی نشان دہی کرتے ہوئے کارفرمایانِ مملکت کو بتایا کہ

> اس قسم کی دیہات سدھار اسکیموں سے جو کچھ بھی ہوگا وہ صرف درخت کے پتوں پر پانی چھڑکنا ہوگا اس کی جڑوں کی سیرابی نہیں ہوگی۔ ہمارے دیہات کی جو خرابیاں گنائی جاتی ہیں وہ ان کے اصلی مرض کی علامات ہیں۔ علتِ مرض ان سب سے الگ ہے۔ وہ علت مرض یہ ہے کہ عام طور پر زمینوں کے مالک زمیندار ہیں اور جو گاؤں کا بیشتر حصہ ان کے کاشتکاروں کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔ یہ بے چارے سال بھر دن رات خون پسینہ ایک کر کے فصل پیدا کرتے ہیں اور اس میں سے کم از کم آدھی فصل زمیندار کے گھر میں چلی جاتی ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ عدم یقین کا ہوا ان پر الگ سوار رہتا ہے کہ نہ معلوم کب زمین کا مالک ناراض ہو جائے اور ہم سے زمین چھین جائے۔ ان حالات میں سب سے مقدم کرنے کا کام وہی ہے جسے قرآن نے ان مشکلات کا حل بتایا ہے۔ قرآن کی رو سے زمین انسانوں کی نشوونما کا ذریعہ ہے۔ اس لئے اس پر بطور جائیداد انفرادی ملکیت قطعاً جائز نہیں۔ لہٰذا زمینداری کا تصور قرآن کے خلاف ہے۔ ہوا کی طرح زمین بھی خدا کی طرف سے مفت عطا کردہ ہے۔ اور یہ عطیہ اس لئے دیا گیا ہے کہ اس سے انسانی پرورش کی ضروریات پوری ہوتی رہیں۔ لہٰذا سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ زمینوں کو انفرادی ملکیت سے نکال کر ملت کی مشترکہ تحویل میں دے دیا جائے تاکہ کوئی شخص محنت کرنے والے کو اس کی محنت کے ماحصل سے محروم نہ کر سکے۔ (شمارہ ۱۲ نومبر ۵۵ء۔ ص۵)

اس کے بعد وزیر اعظم پاکستان کو مخاطب کرتا ہے اور ان کے منصب اقتدار و اختیار سے اپیل کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

> محترم وزیر اعظم دیہی امداد کی اسکیم میں خاص طور پر دلچسپی لیتے ہیں۔ یہ چیز بڑی حوصلہ افزا ہے۔ لیکن ہم ان کی خدمت میں باادب گزارش کریں گے کہ جب تک ہمارے ہاں سے

زمینداری کی لعنت دور نہیں ہوتی گاؤں کے سدھار کی کوئی کوشش صحیح نتیجہ پیدا نہیں کر سکتی۔ اگر محترم وزیر اعظم صاحب دل سے چاہتے ہیں کہ گاؤں والوں کی حالت سدھر جائے تو ان کے لئے سب سے پہلے کرنے کا کام یہی ہے اور جب کہ ان کے ہاتھ میں اختیار و اقتدار کی باگ بھی ہے، ان کے لئے اس تبدیلی کا پیدا کر دینا کچھ مشکل نہیں اگر وہ اپنے عہد وزارت عظمیٰ میں صرف ایک یہی کام کر جائیں تو اس سے نہ صرف پاکستان کی موجودہ نسل کی کایا پلٹ جائے گی بلکہ اس کی آنے والی نسلیں بھی اپنے آپ کو ان کا مرہون منت سمجھیں گی اور چونکہ یہ اقدام قرآن کی تعلیم کے عین مطابق ہوگا اس لئے فطرت کی میزان میں بھی اس کا وزن ہوگا۔ (شمارہ ۱۲۔ نومبر ۱۹۵۵ء صفحہ ۵)

مخلوط انتخاب کا شاخسانہ

پاکستان کی نئی مجلس دستور ساز نئے آئین کی ترتیب و تدوین کا کام شروع کر چکی تھی کہ ملک میں طریق انتخاب طے کرنے کا مرحلہ بھی اس کے سامنے آگیا۔ اور اس سلسلے میں یہ اندیشہ بھی ابھرنے لگا کہ دستور یہ مخلوط طریق انتخاب کے حق میں فیصلہ صادر کرے گی۔ یہ اقدام پاکستان کی اس نظریاتی اساس کو زیر و زبر کرنے کا موجب ثابت ہوتا۔ جس میں طلوع اسلام کا خون جگر بھی شامل تھا۔ چنانچہ ۱۹ نومبر ۱۹۵۵ء کے افتتاحیہ میں اس کے رباب دل کے تاروں کی لرزش، ایک فغاں بن کر فضا میں مرتعش ہوئی۔ اس نے تفصیلاً بتایا کہ کس طرح مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کی اساس پر پاکستان کا ایوانِ مملکت تعمیر ہوا۔ اور اس کے بعد احساس ملی کو جھنجھوڑتے ہوئے اس نے کہا۔

> تشکیل پاکستان کے اس پس منظر میں، آپ سوچئے کہ کیا کسی شخص کے حیطۂ قیاس و خیال و گمان و وہم میں بھی یہ بات آسکتی تھی کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ اس پاکستان سے یہ آواز اٹھے گی اور اٹھے گی بھی انہی مسلمانوں کی طرف سے جنہوں نے جداگانہ قومیت اور جداگانہ انتخاب کے دعوے پر پاکستان کو حاصل کیا تھا کہ یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کا مخلوط انتخاب ہونا چاہیئے۔ لیکن ہماری بدبختی کا کیا علاج کہ اسی پاکستان میں آج یہ آواز اٹھ رہی ہے کہ اس اصول کو پاکستان کے زیر تدوین دستور کا جزو بنا دیا جائے۔

یلیتنی مت قبل ھذا وکنت نسیا منسیا

عبرت آموز!

(ہندوستان کے قارئین طلوعِ اسلام میں سے ایک صاحب نے ہمیں ایک انگریزی اخبار (SUNDAY STANDARD) کا ایک تراشہ بھیجا ہے (جس پر اخبار کی تاریخ اشاعت درج نہیں)۔ اس میں وہاں کی پارسی جماعت کے رفاہِ عام کے کاموں کی کچھ تفصیل درج ہے۔ اس کا خلاصہ ترجمہ درج ذیل کیا جاتا ہے۔ طلوعِ اسلام)

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ (ہندوستان میں) پارسی جماعت کا خیراتی نظام اپنے فرقہ کے ہر فرد کی ضروریاتِ زندگی کے بارے میں، حد سے حد تک ہر بات کا خیال رکھتا ہے۔ اس جماعت کی تعداد یہاں بمشکل ایک لاکھ کے لگ بھگ ہوگی لیکن انھوں نے اپنے ہاں بیاسی ٹرسٹ فنڈ ز قائم کر رکھے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ملک بھر میں یہی ایک جماعت ہے جس کا ایک فرد بھی آج گداگر یا بیکار نہیں۔ ایسی کوئی مثال نہیں مل سکے گی کہ ان کے ہاں کوئی فرد کسی مصیبت میں مبتلا یا بیماری کا شکار رہا ہو۔ اور جماعت اس کی نگہداشت سے قاصر رہا ہو۔

پارسیوں کا امیر و کبیر فرقہ رفاہی امور میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ ان کے ہاں بعض ٹرسٹ مختلف خاندانوں کی طرف سے چھوٹے چھوٹے خیراتی سلسلوں پر مشتمل اور کسی نہ کسی مخصوص رفاہی شعبہ کے لئے وقف ہیں۔ اور بعض ایسے ہیں جن کا سلسلۂ فیض بڑی وسعتوں تک پھیلا ہوا ہے اور ان کا سرمایہ کروڑوں روپوں تک پہنچتا ہے۔ یہ خیراتی تنظیمیں اپنے افراد کی تمام ضروریات ہی کو پورا نہیں کرتیں بلکہ اس قسم کے دیگر اداروں کے مقابلہ میں ان کے سرمایہ کی فیض بخشیاں (بڑی وسعت کے اعتبار سے امتیازی شہرت رکھتی ہیں۔ حالات کے نئے تقاضوں کی بناء پر جب ان کی معاشرتی ضروریات بڑھ جاتی ہیں تو سرمائے میں حسب ضرورت اضافہ

ہو جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں بنیادی اہمیت اس نکتہ کو حاصل ہے کہ یہ مالی امداد "خیرات" کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ افرادِ معاشرہ کی نشو ونما اور خودگری کا سامان قرار پاتی ہے۔

پارسی پنچایت

پارسیوں کی تین عظیم ٹرسٹ ـــــ این۔ ایم۔ واڈیا چیریٹیز، سر رتن ٹاٹا ٹرسٹ، اور سر دوراب جی ٹاٹا ٹرسٹ ـــــ رفاہِ عامہ کے ادارے ہیں۔ بعض ادارے اتنے ہی قدیم ہیں جتنی کہ اس فرقے کی اپنی ابتداء۔ مثلاً قدیم رفاہی ادارہ، پارسی پنچایت [illegible] میں قائم ہوا تھا۔ اس کا آغاز ایک معاشرتی تنظیم کی حیثیت سے ہوا لیکن جلد ہی اس نے اپنے فرقے کی فلاح و بہبود کے ابھرتے ہوئے تقاضوں کو محسوس کیا اور [illegible] میں یہ پنچایت ایک پبلک ٹرسٹ کی حیثیت سے رجسٹرڈ ہو گئی۔ پارسی پنچایت آج اپنے فرقے کا پورا نظم حیات اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے۔ یہ عمر رسیدہ افراد کی نگہداشت کا انتظام کرتی ہے۔ طلباء اور ضرورت مند خاندانوں کے لئے وظائف اور عام امداد کی صورت پیدا کرتی ہے۔ ایک شعبۂ روزگار اس کے زیر اہتمام سرگرم کار ہے۔ ایک (TOWER OF SILENCE) جہاں مردوں کی تدفین کی جاتی ہے ـــــ اس کی تحویل میں ہے۔ کاروباری اور تجارتی شعبوں سے متعلق کلاسیں اسی کے زیر اہتمام جاری ہیں۔ ایک نرسری سکول اور دارالصحت کا انتظام بھی اس کے ہاتھوں میں ہے۔ اور اس طرح یہ پنچایت اپنے فرقے کی فلاح و بہبود کے لئے دو لاکھ روپے سالانہ کا خرچ برداشت کرتی ہے۔

اس ملک میں پارسی فرقہ شاید وہ واحد فرقہ ہے جو عمر رسیدہ اور معذور افراد کی منظم طور پر دستگیری کرتا ہے۔ ایک صدی قبل سر ایف۔ ایس۔ پرتیج نے عمر رسیدہ افراد کی قیام گاہ کے طور پر ایک شاندار عمارت تعمیر کی۔ اس کا آغاز بڑی سادگی سے ہوا لیکن آج یہ عمارت ایک سو تیس بوڑھے اور معذور افراد ـــــ چوہتر مرد اور چھپن عورتوں کو اپنی پناہ میں لئے ہوئے ہے۔

بے بسوں کی پناہ گاہ

یہ لوگ تن تنہا نہیں ہوتے۔ ان میں بہت سی تعداد ہے جن کے خاندان اور عزیز شہر میں بستے ہیں لیکن جب یہ رشتہ دار محسوس کرتے ہیں کہ کسی وجہ سے، وہ ان عمر رسیدہ افراد کی نگہداشت کے قابل نہیں رہے تو انہیں محتاج خانوں میں پناہ مل جاتی ہے۔ جسمانی عوارض کے شکار، پیرانہ سالی کی نقاہت سے لاچار اور وہ کہن سال جن کی عمر سینتالیس سال سے تجاوز کر چکی ہو انہیں اس عمارت میں، جو پرتیج دھرم سالہ کے نام سے یاد کی جاتی ہے، داخلہ کے لئے اذن عام ہے۔

یہ دھرم سالہ انہیں عیش و عشرت کے سامان تو مہیا نہیں کرتی۔ لیکن ان کی ضروریاتِ زندگی کی کفالت ضرور کرتی ہے۔ بیسیوں مرد اور عورتیں جن کے اعضاء پر بڑھاپے کی لرزش اور نقاہت طاری ہوتی ہے۔

جن کی نگاہوں میں افسردگی اور اداسیاں جھلکتی ہیں، اُٹھتے بیٹھتے یا بستروں پر آنکھیں موند کر بیٹھے ہوئے۔ جن میں کتنے ہی شکووں کو سمائے ہوئے مریض اور نہ پیران کہن سال جو زمانے کی اس بے وفائی کے شکوہ سنج ہیں کہ اس نے انہیں یکسر بھلا دیا اور فطرت کے خلاف غیظ آلود کہ اس نے اس عالم میں انہیں سسک سسک کر مرنے کے لئے چھوڑ دیا۔ یہ ہیں وہ کس مپرسی کے عالم میں جینے والے لوگ جو اس پناہ گاہ میں آرام سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اگر اس فرقہ کے مخیر حضرات نے ان بیچاروں کے لئے یہ انتظامات نہ کئے ہوتے تو پھر سوچئے کہ یہ لوگ کس طرح بے بسی کے عالم میں سر راہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑتے۔

یہ دھرم سالہ ایک وسیع ہوادار عمارت ہے۔ سات لڑکے اور پانچ عورتیں یہاں کے مکینوں سے متعلق اپنے فریضہ کی ادائیگی پر مامور ہیں۔ یہ ان کہن سال اور مریض پناہ گزینوں کو نہلاتے اور کھانا کھلاتے ہیں۔ مریضوں کی نگہداشت کے لئے یہاں دو نرسیں مقرر ہیں اور ہفتے میں دو بار ڈاکٹر ان کا معائنہ کرتا ہے۔

ان پناہ گزینوں میں سے اکثر نچلے درجے کے اوسط طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں سے اکثر خواندہ ہیں اور کچھ زیادہ تعلیم یافتہ جنہیں حالات نے بیچارگی کا شکار بنا ڈالا۔ ان کی دیکھ بھال کے لئے ایک سپرنٹنڈنٹ بھی متعین کیا گیا ہے۔ علاوہ بریں ٹرسٹیوں نے کچھ سوشل ورکر بھی مامور کر رکھے ہیں جو ان مصیبت کے ماروں سے گھل مل کر ان کا غم غلط کرنے میں کوشاں رہتے ہیں۔ مزید براں ایک مشاورتی مجلس موجود ہے جو ہر ماہ دھرم سالہ میں اپنا اجلاس کرتی ہے تاکہ ابھرتے ہوئے تو بہ نو مسائل کا حل تجویز کر سکے۔ جیسا کہ بتایا گیا ہے۔ ان انتظامات پر چھ سات ہزار روپے ماہوار خرچ اٹھتا ہے۔

پارسی پنچایت اور اس سے ملحق اداروں کی سرگرمیوں کا ایک اور اہم ترین گوشہ خاندانی فلاح و بہبود کے مسائل ہیں۔ اس سلسلہ میں ہنگامی اور خصوصی ضروریات، مثلاً بیماری، شادی اور قرضوں کی ادائیگی سے عہدہ برآ ہونے کے لئے عطیات دیئے جاتے ہیں۔

شعبۂ روزگار پنچایت کا شعبۂ روزگار ہر ماہ تیس سے پچاس تک افراد کے روزگار کا انتظام کرتا ہے۔ اس سے متعلق کاروباری رہنمائی کا شعبہ صلاحیتوں کی جانچ پڑتال سے عہدہ برآ ہوتا ہے جس کی بدولت ملازمتوں کی زیادہ سے زیادہ نشاندہی کرتا ہے اور اگر ضروری قرار پا جائے تو متعلقہ شعبہ سے متعلق نوجوانوں کے لئے تعلیم و تربیت کا بھی اہتمام کرتا ہے۔

رہائشی بستیوں کی تعمیر پارسی ٹرسٹ اپنے فرقہ کی ضروریات پر کڑی نگاہ رکھتے ہیں اور جہاں کہیں اور جس وقت کسی کو امداد کی ضرورت درپیش ہو اسے فی الفور بہم

دیتے ہیں جب رہائشی قیام گاہیں نایاب ہو جاتی ہیں تو کئی خیراتی ادارے آگے بڑھتے ہیں اور اپنے افراد کے لئے نئی بستیوں کی تعمیر کا سلسلہ شروع کر دیتے ہیں۔ اس قسم کی نصف درجن رہائشی بستیاں شہر کے اچھے اچھے حصوں میں موجود ہیں جہاں کم آمدنی والے پارسی رعایتی کرایہ پر آرام دہ مکان حاصل کر سکتے ہیں۔ اس قسم کی بستیوں میں تین کمروں کا ایک اچھا فلیٹ عام طور پر تیس چالیس روپے ماہوار پر مل جاتا ہے۔ یہاں ایک کمرے کے مختصر سے فلیٹ سے لے کر چھ سات کمروں کے بنگلہ تک ہر نوع کے مکانوں کا سلسلہ موجود ہے۔ کرائے کی یہ آمد عام طور پر ان عمارتوں کی مرمت کے ضروری اخراجات کی کفیل ثابت ہوتی ہے۔

ان بستیوں میں آباد افراد کے لئے رفاہی خدمات مہیا کی جاتی ہیں جو درس گاہوں لائبریریوں، کھیل کے میدانوں اور خواتین کے کاروباری مراکز پر مشتمل ہوتی ہیں منتظمین کو بہر حال اس کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ درخواست دہندگان میں سے صرف وہ حقیقی مستحقین اس سے مستفید ہو سکیں جنہیں واقعی اس کی ضرورت لاحق ہے۔

طلباء کی سرپرستی

اپنے فرقہ کے لئے پارسی پنچایت نے بہترین ساز و سامان سے آراستہ نرسری سکول بھی شہر میں قائم کر رکھا ہے۔ اس قسم کے سکول مختلف پارسی بستیوں سے بھی ملحق ہیں۔ زیر تعلیم بچوں کے لئے جو اپنے اسباق کی تیاری میں مدد کے طالب ہوں خصوصی کلاسوں کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے۔ کالجوں کے طلباء و طالبات کی رضاکارانہ خدمات اس سلسلہ میں بروئے کار لائی جاتی ہیں۔ ان رضاکاروں کو بطور الاؤنس روزانہ دو روپے دیئے جاتے ہیں تعلیمی سہولتوں اور مالی امداد جو پارسی طلباء کو ٹرسٹ فنڈ سے مہیا کی جاتی ہے حیرت انگیز فیاضی روا رکھی جاتی ہے۔ درجہ میٹرک کے بعد کی تعلیمات، کاروباری تربیت اور غیر ممالک میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے خواہشمند طلباء کی امداد کے لئے مشترکہ ٹرسٹ فنڈ قائم کئے گئے ہیں۔ بیس سال قبل ضرورت مند طلباء کو وظائف مہیا کرنے کے لئے چودہ ٹرسٹوں نے اپنے وسائل آمدنی میں اشتراک باہمی کی صورت پیدا کی تھی۔

سنہ ۱۹۶۱ء میں ۱۷۰ طلباء نے میٹرک کے بعد اپنا سلسلۂ تعلیم جاری رکھنے کے لئے مالی امداد کی درخواست کی۔ ان میں سے ۱۰۲ درخواستوں کو قبول کر لیا گیا۔ ان میں سے اکثریت نے بی۔ ایس۔ سی اور بی۔ اے کرنے کا فیصلہ کیا اور ایک نے ایم۔ ایس۔ سی کا۔ انہیں جو مالی امداد مہیا کی گئی وہ ٹیوشن فیس، رہائشی اخراجات اور نصابی کتابوں وغیرہ کی خرید کے سلسلے میں تھی حقیقی ضروریات کے تمام معاملات میں مطلوبہ مالی امداد مل جاتی ہے۔ اور صرف انہی طلباء کے معاملہ میں معذوری ظاہر کی جاتی ہے جن کے بارے میں یہ معلوم ہو کہ وہ مزید حصول تعلیم کی صلاحیتوں سے عاری ہیں یا بار بار امتحان میں ناکام ہو چکے ہیں یا جن کے والدین

ان کے اخراجات برداشت کرنے کے قابل نہیں۔

پچھلے سال مشترکہ ٹرسٹوں نے فنی اور کاروباری تعلیم و تربیت سے متعلق وظائف کے سلسلے میں ستائیس ہزار کی رقم مہیا کی۔ ۱۲۰ طلبا میں سے جنہوں نے اس مقصد کے لئے درخواست کی صرف آٹھ طلباء کو امداد مہیا کرنے سے معذوری ظاہر کی گئی۔ باقی سب مطلوبہ امداد سے مستفید ہوئے۔ اس امداد کی بدولت وہ فنی تعلیم کے مختلف شعبوں میں داخلہ لینے کے قابل ہو گئے جس میں سول مکینیکل، الیکٹریکل انجینئرنگ، فن تعمیر اور ٹیکسٹائل ٹکنالوجی کی تعلیمات بھی شامل ہیں۔ اس امر کا یقین حاصل کرنے کے لئے کہ یہ امدادی رقوم ضائع نہ ہونے پائیں، درخواست دہندگان کو کاروباری رہنمائی اور اپنی صلاحیتوں کی جانچ پڑتال کے مراحل طے کرنے ہوتے ہیں اور تب جا کر کہیں ان کے لئے وظائف کی منظوری طے پاتی ہے۔

اسی طرح ان وظائف کے طفیل ۱۹۶۱ء میں چوبیس طلباء کو برطانیہ اور امریکہ میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کا موقع ملا۔ ان طلباء کو باسٹھ ہزار روپے بطور وظائف عطا کئے گئے اور سترہ ہزار کی رقوم بطور قرض دی گئیں۔

پارسی خیراتی امور کی عارضہ تعلیمی کمیٹی کا قیام سولہ سال قبل عمل میں آیا۔ یہ کمیٹی ۱۹۶۱ء تک ۲۶۳ طلباء کو دس لاکھ روپے سے زیادہ رقوم وظائف کی صورت میں مہیا کر چکی ہے۔ ان طلباء میں سے ۱۲۱ طالب علم اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بعد بیرونی ممالک سے واپس آ چکے ہیں۔ ۲۷ فارغ التحصیل طلباء نے عملی تجربہ حاصل کرنے کے لئے بیرونی ممالک میں ہی عارضی ملازمتیں حاصل کر لی ہیں۔ ۳۸ طلباء برطانیہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور اسی طرح ۴۴ امریکہ میں۔ ان طلباء نے جو نصاب اختیار کر رکھے ہیں وہ ٹیکسٹائل ٹیکنالوجی، سٹرکچرل انجینئرنگ، راڈار انجینئرنگ، فارکیمیوسٹیکلز، ایف۔ آر۔ سی۔ ایس (میڈیسن) سوشیالوجی اور جنرل سائنس پر مشتمل ہیں۔

ان تعلیمی عطیات کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اسے پوری طرح ملحوظ رکھا جاتا ہے کہ عطیات پانے والے کسی قسم کی ذلت محسوس نہ کرنے پائیں۔ یہ عطیات قابلیت کی بنا پر دیئے جاتے ہیں۔ اسے افراد کی منشاء پر نہیں چھوڑا جاتا بلکہ ایک مجلس انتخاب اس کا فیصلہ کرتی ہے۔

غریب طلباء کیلئے ہوسٹل

یہ ٹرسٹ اور خیراتی تنظیمیں غریب طلباء کے لئے ہوسٹل بھی قائم کئے ہوئے ہیں۔ اس قسم کا ایک ہوسٹل بمبئی کی گماد یا کالونی میں واقع ہے۔ علاوہ بریں سورت کے قریب مٹ ہور حکیم جی سکول اور ہوسٹل موجود ہیں۔ یہ ان نواحی قصبات کے طلباء کیلئے وقف ہیں جہاں تعلیمی سہولتوں کا فقدان ہے۔

ان مراعات اور وظائف میں جو مختلف ٹرسٹوں کی طرف سے پیش کئے جاتے ہیں تطابق قائم رکھنے، فلاحی امور کو دوعملی کی الجھنوں سے بچانے اور ممکن الحصول رقوم کو زیادہ سے زیادہ مفید بنانے کے لئے پارسی خیراتی اداروں نے ۱۹۳۷ء میں ایک رابطہ کمیٹی قائم کی تھی۔ وظائف اور مالی امداد کے سلسلے میں تمام درخواستیں اسی کمیٹی کی وساطت سے تکمیل کے مراحل طے کرتی ہیں جس سے اکثر اوقات تحقیقاتی ادارہ کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ اڑتیس بڑے بڑے اداروں نے اس کمیٹی سے اشتراک قائم کر رکھا ہے۔ کمیٹی نے بچوں کی خدمات کا سلسلہ بھی قائم کر رکھا ہے جو تربیتی نگہداشت، نشوونما اور قیام و طعام کے امور پر مشتمل ہے۔ ایسے بچے جو بدقسمتی سے بے گھر رہ جائیں، یا ان کے گھرسا مان مسرت سے محروم ہوں انھیں یتیم خانوں میں نہیں بھیجا جاتا حتی الامکان کوشش کی جاتی ہے کہ انھیں ان کے رشتہ داروں کی سرپرستی میں رکھا جائے۔ ان بچوں کو بیرونی تربیت گاہوں میں رکھا جائے یا ان کے رشتہ داروں کی تحویل میں، ان کے اخراجات بہرحال کمیٹی کی طرف سے ادا کئے جاتے ہیں۔

پارسی خواتین کے کارنامے

پارسی خواتین نے ان خیراتی کارفرمائیوں میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اکثر اداروں میں وہ ٹرسٹیوں کی حیثیت سے شامل ہیں۔ ستری زرتھوستی منڈل (پارسی خواتین کا ادارہ) نے سو سال قبل عورتوں کے لئے پہلا صنعتی سکول قائم کیا تھا۔ آجکل اُسے سر رتن ٹاٹا انڈسٹریل انسٹی ٹیوٹ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ انسٹی ٹیوٹ تین سو پارسی خواتین کو روزگار مہیا کرتا ہے۔ اس کا ایک شعبہ کھانے پکانے سے متعلق ہے جہاں انواع و اقسام کے کھانے تیار ہوتے ہیں۔ ایک شعبہ خوراک مہیا کرنے سے متعلق ہے۔ دستی اور مشینی کشیدہ کاری اور بچوں کے ملبوسات سے متعلق الگ شعبے ہیں یہ تمام شعبے بڑے کامیاب ثابت ہوئے ہیں۔ ادارہ اپنی کارکردگی کے بلند معیار کے اعتبار سے نمایاں شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ روزگار مہیا کرنے کے لحاظ سے تو یہ ادارہ مثالی مقام رکھتا ہے۔ اس سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے اُسے وہاں کے کارکنوں کو دیدیا جاتا ہے۔ ان کے لئے ایک ہوسٹل کا انتظام ہے۔ گاہے بگاہے انھیں مالی امداد بھی دی جاتی ہے۔ ان کے بچوں کے تعلیمی واجبات ادا کئے جاتے ہیں اور علاج معالجہ کی سہولتیں بھی مہیا کی جاتی ہیں۔

درخشندہ مثال

ملک کی اس چھوٹی سی جماعت نے فلاح انسانیت کے میدان میں دیگر جماعتوں کے سامنے ایک مثال قائم کی ہے۔ معاملہ محض بڑی بڑی رقوم کے خرچ کرنے کا نہیں، اصل حقیقت یہ ہے کہ سرمائے کی تنظیم اس حسن انداز سے کی گئی ہے کہ اس کی بدولت پارسیوں کے خیراتی ٹرسٹ بے مثال اداروں کا مقام حاصل کر گئے ہیں۔ معنوی نقطۂ نظر سے ان کی خیرات ایک "منظم خیرات" کی

حیثیت رکھتی ہے ۔ مقصد پیش نظر "خیرات کی تقسیم" نہیں بلکہ افراد معاشرہ کو نشو و نما کے سامان مہیا کرنا ہے۔ اس سلسلۂ امداد سے مقصود یہ ہے کہ مختلف خاندان زیر و زبر ہو کر نہ رہ جائیں اور افراد کی صلاحیتوں کو نشو و نما کے مواقع حاصل رہیں۔

طلوعِ اسلام یہ ہے مختصر سی روئیداد، رفاہ عامہ کے امور سے متعلق اس جماعت کی جس کی کل آبادی، ہندوستان میں ایک لاکھ سے زیادہ نہیں۔ کبھی وہ زمانہ تھا کہ غیر مسلم اقوام مسلمانو کے رفاہ عامہ کے امور کو بطور مثال پیش کیا کرتی تھیں۔ اور اب حالت یہ ہے کہ ہم اس مختصر سی غیر مسلم جماعت کے ان کارناموں کو، ہندوستان کے چار پانچ کروڑ، اور پاکستان کے سات آٹھ کروڑ مسلمانوں کے سامنے بطور مثال پیش کرتے ہیں بالخصوص پاکستان کے مسلمانوں کے سامنے، جن میں اب کئی "ٹاٹا" اور کئی "برلا" موجود ہیں۔ پھر سنئے کہ اس (پارسی) جماعت میں

کوئی بچہ تعلیم سے محروم نہیں۔

کوئی فرد کاسب، بے روزگار نہیں۔

کوئی شخص بھوکا نہیں۔

کوئی بوڑھا، بیکس، لاچار، اپنے آپ کو تنہا محسوس نہیں کرتا۔

کوئی مریض، علاج اور دوا سے محروم نہیں۔

کوئی عورت پناہ کے بغیر نہیں۔

کوئی یتیم، لاوارث، بچہ ماں باپ جیسی شفقت سے محروم نہیں۔

خدا کرے کہ یہ مثال ہمارے ہاں کے کسی ایک "ٹاٹا" کے دل میں غیرت کا احساس بیدار کر دے! (طلوعِ اسلام)

راولپنڈی کے احباب

نوٹ فرمالیں کہ ہر جمعہ بوقت چار بجے شام بمقام الکوثر بلڈنگ بالمقابل گورنمنٹ گرلز کالج مری روڈ پر محترم پرویز صاحب کا درس قرآن مجید بذریعہ ٹیپ سنایا جاتا ہے۔ " بزم طلوعِ اسلام۔ راولپنڈی "

کیا
آپ نے یہ کتابیں دیکھی ہیں؟

فجر الاسلام
مصر کے نامور مؤرخ علامہ احمد امین
مرحوم کی شہرۂ آفاق تصنیف کا اردو
ترجمہ۔ زمانہ قبل از اسلام کے
حالات۔ سلطنت اسلامیہ کی داستان
قرن اول کی تاریخ اور علمی ترقی
صفحات ... مجلد۔ قیمت ... آٹھ روپے

اسلام پر کیا گذری
علامہ احمد امین مصری کے سلسلہ
تاریخ اسلام کی دوسری کڑی
بنی امیہ اور بنی عباس کے زمانے میں
اسلام کیا سے کیا ہو گیا
اس دور میں کون کون سی باتیں
اسلام میں داخل کی گئیں۔ یہ ساری کہانی پڑھئے
قیمت۔ پانچ روپے

ہمارا ماضی اس قدر شاندار تھا لیکن ہمارا حال اس قدر تاریک ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے
اسباب زوال امت
میں اس کا صحیح جواب مل سکے گا۔!
سستا ایڈیشن قیمت ایک روپیہ

حضرت عثمانؓ کی شہادت
کا ذمہ دار کون ہوتا ہے؟
مصر کے نابینا عالم ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے
اسی موضوع پر بڑی تحقیق کے بعد
الفتنة الکبریٰ
ایک بلند پایہ کتاب شائع کی۔ یہ اسی کا اردو ترجمہ ہے۔ قیمت۔ چار روپے

جمع القرآن
کیا قرآن کریم حضور نے خود ہی جمع کر دیا تھا؟
یا اسے بعد میں جمع کیا گیا۔ اس سوال کا مختصر مگر جامع جواب
قیمت
ایک روپیہ

فہرست کتب ایک کارڈ لکھ کر مفت طلب کیجئے

ملنے کا پتہ
میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ ۲۷۔ بی شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور